شعبہ برائے جمہوریت، انسانی حقوق اور محنت

انسانی حقوق پر مشتمل کارروائیوں کے بارے میں کنٹری رپورٹ ۲۰۱۸ء

پاکستان

فہرستِ مضامین

انتظامی خلاصہ
سیکشن اول: انسانی زندگی کی سلامتی کا احترام، بشمول:
الف) زندگی سے جبری محرومی اور غیر قانونی اور سیاسی بنیادوں پر ہلاکت سے آزادی
ب) گمشدگی
ج) تشدد اور دیگر وحشیانہ، غیر انسانی اور تحقیر آمیز برتاؤ، سزا، قید و بند اور نظر بندی سے آزادی
د) جبری حراست یا نظر بندی سے آزادی
ہ) منصفانہ عوامی عدالتی کارروائی سے محروم کیئے جانے سے آزادی
و) چادر اور چہار دیواری، خط و کتابت کے معاملات میں بے جا یا غیر قانونی مداخلت سے آزادی
ز) اندرونی تنازعات میں بدسلوکی سے آزادی
سیکشن دوئم: شخصی آزادیوں کا احترام، بشمول:
الف) اظہارِ رائے کی آزادی بشمول ذرائع ابلاغ کی آزادی
ب) پُرامن اجتماع اور وابستگی کی آزادی
ج) مذہبی آزادی
د) نقل و حرکت کی آزادی
سکشن سوئم: سیاسی عمل میں حصہ لینے کی آزادی
سیکشن چہارم: بدعنوانی اور حکومتی اُمور میں عدم شفافیت
سیکشن پنجم: انسانی حقوق کی مبینہ پامالیوں سے متعلق بین الاقوامی اور غیر سرکاری تحقیقات میں حکومتی رویہ
سیکشن ششم: تفریق، معاشرتی بدسلوکی اور بردہ فروشی
خواتین
اطفال
یہودی مخالفت
بردہ فروشی
معذور افراد

جنسی اور صنفی بنیادوں پر روا پُر تشدد واقعات، امتیاز اور بد سلوکی

ایچ آئی وی اور ایڈز سے متعلق معاشرتی حقارت

دیگر معاشرتی تشدد اور امتیازی سلوک

سیکشن ہفتم: مزدوروں کے حقوق

الف) انجمن سازی کی آزادی اور اجتماعی سوداکاری کا حق

ب) جبری مشقت اور بیگار کی ممانعت

ج) بچوں کی مشقت کی ممانعت اور ملازمت کے لیئے عمر کی کم سے کم حد

د) ملازمت یا پیشہ کی بنیاد پر امتیازی سلوک

ہ) کام کے لیئے قابل قبول شرائط

انتظامی خلاصہ

پاکستان ایک وفاقی پارلیمانی ریاست ہے۔ جولائی میں پاکستان تحریکِ انصاف (پی ٹی آئی) نے عام انتخابات میں قومی اسمبلی کی سب سے زیادہ نشستیں حاصل کیں اور اگست میں پی ٹی آئی کے عمران خان ملک کے وزیر اعظم بن گئے۔ اگرچہ آزاد مبصرین نے الیکشن کمیشن آف پاکستان کی طرف سے پولنگ کے عمل میں بعض تکنیکی بہتریوں کو محسوس کیا، کچھ مبصرین، سول سوسائٹی کی تنظیموں اور سیاسی جماعتوں نے الیکشن سے قبل فوج اور خفیہ ایجنسیوں کی طرف سے مداخلت کے حوالے سے اپنی تشویش کا اظہار کیا جس کی وجہ سے مقابلے کا غیر منصفانہ ماحول بن گیا۔ بعض سیاسی جماعتوں نے الیکشن کے دن قابل ذکر بے قاعدگیوں کا الزام لگایا۔

فوج اور خفیہ ایجنسیاں برائے نام سول حکام کو جوابدہ رہیں مگر عملی طور پر بغیر سویلین نگرانی کے کام کرتی رہیں۔

انسانی حقوق سے متعلق مسائل میں ماورائے عدالت قتل اور چُن چُن کر ہلاک کرنے کی مصدقہ رپورٹس، جبری گمشدگیاں، تشدد، عدالتی کارروائی سے قبل زبردستی اور طویل حراست، چادر اور چار دیواری کی پامالی، سنسر شپ، ویب سائٹس پر پابندی، صحافیوں کی نقل و حرکت کی آزادی پر بے جا پابندیاں، نامور صحافیوں اور صحافتی اداروں کے خلاف حملے، ہراسگی اور دھونس دھمکی، پُرامن اجتماعات اور انجمن سازی پر سرکاری پابندیاں بشمول غیر سرکاری تنظیموں کے قوانین پر پابندیاں، مذہبی اقلیتوں کے خلاف مذہبی آزادیوں پر پابندیاں، نقل و حرکت کی آزادی پر پابندیاں، حکومت میں بدعنوانی، غیر ریاستی مسلح جتھوں کی جانب سے کمسن فوجیوں کی بھرتی اور استعمال، عصمت دری سے متعلق کیسوں کی تفتیش میں شفافیت کی کمی یا فوجداری تحقیقات کی کمی، جنسی ہراسگی، نام نہاد غیرت کے نام پر کیئے جانے والے جرائم، عورتوں کے نازک اعضاء کو زِک پہنچانا، جنس یا جنسی شناخت یا جنسی رجحان کی بنیاد پر تشدد، ہم جنس پرستانہ رویوں کے حوالے سے قانونی ممانعت، جبری مشقت، بین الاقوامی سطح پر بردہ فروشی اور بیگار اور بچوں کی جبری مشقت کی بدترین مثالیں شامل ہیں۔

حکومت کے احتساب کی کمی رہی، اور بدعنوانی کے واقعات پر پر تادیبی کارروائی نہیں ہو سکی، جس کی وجہ سے ان کاموں میں سرکاری یا غیر سرکاری سطح پر ملوث افراد میں سزا سے بالاتر ہونے کا کلچر پروان چڑھا۔ ارباب اقتدار نے شاذونادر ہی سرکاری اہلکاروں کے خلاف انسانی حقوق کی پامالیوں پر تادیبی کارروائی کی۔

غیر ریاستی عناصر کی جانب سے دہشتگردانہ تشدد اور انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں نے انسانی حقوق کے مسائل میں اضافہ کیا۔ فوج، پولیس اور قانون نافذ کرنے والے اداروں کی جانب سے دہشتگرد گروپوں اور جنگجوئوں کے خلاف کارروائیاں جاری رہیں۔ تاہم مقامی اور بیرونی پر تشدد تنظیموں اور غیر ریاستی عناصر کی جانب سے تشدد اور زیادتیوں نے لاقانونیت کے کلچر کو فروغ دیا۔ جنوبی ایشیا ٹیررزم پورٹل، جو کہ انسٹی ٹیوٹ فار کونفلکٹ مینجمنٹ کا عوامی مفاد کی پیروی کرنے والا ادارہ ہے اور جو جنوبی ایشیا میں دہشتگردی اور کم شدت کی جنگجوانہ کارروائیوں کے حوالے سے اعداد و شمار جمع کرتا ہے، کے مطابق ۲۳ دسمبر تک دہشتگردی سے مرنے والوں کی تعداد ۶۸۶ رہی جبکہ ۲۰۱۷ء میں یہ تعداد ۱۲۶۰ تھی۔

سیکشن اول: انسانی زندگی کی سلامتی کا احترام، بشمول:

الف) زندگی سے جبری محرومی اور دیگر غیر قانونی ہلاکتیں یا سیاسی قتل

ایسی بیشمار رپورٹیں تھیں جن کے مطابق حکومت یا اس کے کارندوں نے اندھا دھند یا غیر قانونی طور پر لوگوں کو ہلاک کیا۔ قانون نافذ کرنے والے ادارے ملک بھر میں مختلف تنازعات میں ماورائے عدالت ہلاکتوں میں ملوث رہے (سیکشن الف۔ز بھی دیکھئے)۔

۱۳ جنوری کو پولیس نے کراچی (سندھ) میں ایک پشتون نوجوان نقیب اللہ محسود کو گولی مار کر قتل کر دیا۔ کراچی پولیس نے اس ہلاکت کو ابتدائی طور پر دہشت گردی کے خلاف آپریشن کا نام دیا۔ محسود کے خاندان والوں کے مطابق اس کو دس دن پہلے ہی زیر حراست لے لیا گیا تھا۔ پاکستان نیشنل کمیشن فار ہیومن رائٹس، جو انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کے خلاف تحقیقات کا ایک آزاد ادارہ ہے، کے مطابق پولیس نے ایک جعلی مقابلے کا اہتمام کیا تاکہ محسود کو ماورائے عدالت قتل کیا جا سکے۔ مزید برآں، رپورٹ نے کراچی کے ضلع ملیر کے اس وقت کے سینئر سپرنٹنڈنٹ آف پولیس راؤ انوار کو اسی طرح کے جعلی پولیس مقابلوں میں ۴۴ دیگر اموات میں ملوث قرار دیا۔ سپریم کورٹ نے سندھ پولیس کے انسپکٹر جنرل کو حکم دیا کہ وہ اس ہلاکت اور اس میں انوار کے کردار کی فوری تفتیش کروائیں۔ حکام نے انوار کو اس کے عہدہ سے ہٹا دیا۔ وہ فرار ہو گیا مگر بالآخر اسے گرفتار کر لیا گیا۔ بعد میں اسے ضمانت پر رِہا کر دیا گیا اور اس کا مقدمہ ۳ دسمبر تک جاری تھا۔

سرکاری تحویل کے دوران جسمانی تشدد سے کچھ ملزمان اپنی جانوں سے گئے۔ مقدمات میں طویل التواء اور ان ہلاکتوں کے ذمہ داران کے خلاف کسی تادیبی کارروائی کے نہ ہونے کے سبب قانون سے بے خوف ہونے کا رواج پروان چڑھا۔ فروری میں پولیس اہلکار بغیر کسی وارنٹ کے راولپنڈی میں ایک گھر میں گھس گئے، ایک رہائشی کو حراست میں لیا اور تھانے میں اپنی تحویل کے دوران مار مار کے ہلاک کر دیا۔ وہ چار اہلکار جو بغیر کسی وارنٹ کے اس نوجوان کے گھر میں داخل ہوئے تھے اس کیس کی تحقیق کے دوران معطل کر دیئے گئے مگر نومبر تک یہ واضح نہیں تھا کہ اس کیس میں مزید کوئی پیشرفت ہوئی یا نہیں۔

۱۰ جنوری کو پولیس نے قصور (پنجاب) کے علاقے میں پولیس اسٹیشن پر دھاوا بولنے والے ایک ہجوم پر مبینہ طور پر گولی چلا دی جو ضلع میں حل نہ ہونے والے بچوں سے زیادتی اور قتل کے مقدمات کیخلاف مظاہرہ کر رہا تھا۔ اس کے نتیجے میں دو شہری ہلاک جبکہ ایک زخمی ہو گیا۔ پولیس نے مؤقف اختیار کیا کہ پہلا فائر ہجوم کی جانب سے کیا گیا تھا۔

پولیس پر ہلاکت خیز حملوں کی بیشمار رپورٹیں سامنے آئیں۔ ۹ جنوری کو ایک گاڑی بلوچستان کی صوبائی اسمبلی کی عمارت کے باہر قائم ایک پولیس چیک پوسٹ سے ٹکرا گئی جس کے نتیجے میں پانچ پولیس اہلکار ہلاک ہو گئے۔ تحریک طالبان پاکستان (ٹی ٹی پی) نے یہ کہتے ہوئے اس واقعے کی ذمہ داری قبول کی کہ اس حملہ کا نشانہ اسمبلی کی عمارت نہیں بلکہ پولیس کے اہلکار تھے۔ مارچ میں تین پولیس اہلکار پنجاب میں اس وقت ہلاک ہو گئے جب ان کی گاڑی دیسی ساختہ بارودی سرنگ سے جا ٹکرائی۔ ۲۴ اپریل کو بلوچستان میں دس پولیس اہلکار تین مختلف خودکُش حملوں میں ہلاک ہوئے۔ ٹی ٹی پی سے علیحدگی اختیار کرنے والے حزب الاحرار گروپ نے ان واقعات کی ذمہ داری قبول کی۔ اگست میں گلگت بلتستان کے علاقے میں دو دہشتگردوں نے ایک پولیس چوکی پر حملہ کر کے تین پولیس اہلکاروں کو ہلاک کر دیا۔

جنگجوؤں اور دہشتگرد گروپوں نے خودکُش حملوں، بم دھماکوں اور دیگر پُر تشدد واقعات میں سینکڑوں لوگوں کو ہلاک اور ہزاروں کو زخمی کیا۔ (سیکشن اول "ز" دیکھئے)۔

ب) گمشدگی

ملک کے تقریباً تمام ہی علاقوں میں اغواء اور جبری گمشدگی کے واقعات رونما ہوئے۔ جبری گمشدگیوں کے حوالے سے قائم تحقیقاتی کمیشن کو ۲۰۱۷ء کے مقابلے میں زیادہ شکایات موصول ہوئیں۔ تیرہ اکتوبر تک کمیشن کو ۸۹۹ کیسوں کا سامنا رہا جبکہ سال ۲۰۱۷ء میں ایسی شکایتوں کی کُل تعداد ۸۶۸ تھی۔ مبینہ طور پر خفیہ ایجنسیوں، پولیس اور قانون نافذ کرنے والے دیگر اداروں نے اپنے زیر حراست افراد کو کسی بھی قسم کے رابطوں سے محروم رکھا اور ان کی جائے حراست کو خفیہ رکھا۔

۱۵ فروری کو بدین (سندھ) میں سادہ کپڑوں میں ملبوس سیکورٹی اہلکاروں نے روزنامہ کوشش سے وابستہ سینئر صحافی رفاقت علی جروار کو مبینہ طور پر اغواء کر لیا۔ ذرائع ابلاغ کی رپورٹوں کے مطابق جروار اس سے پہلے ایک سندھی قوم پرست گروپ سے وابستہ تھا۔

۶ جون کو معروف صحافی اور مضمون نگار گل بخاری کو نامعلوم افراد نے لاہور سے اغواء کیا۔ جب ان کی گمشدگی کی خبریں میڈیا کی زینت بنیں اور ان کے اس کیس کو سوشل میڈیا پر اچھالا گیا تو ان کو چند گھنٹے بعد رہا کر دیا گیا۔ وہ فوج اور سیکورٹی اداروں کی معروف ناقد سمجھی جاتی ہیں اور اپنے اغواء سے دو دن پیشتر ہی فوج کی جانب سے ان کو سوشل میڈیا پر ریاست کے لیئے خطرہ قرار دیا گیا تھا۔ گل بخاری نے اپنے اغواء کاروں کی نشاندہی نہیں کی۔

میڈیا نے یہ خبر دی کہ دسمبر ۲۰۱۷ء میں سول سوسائٹی کے سرگرم کارکن رضا خان لاہور میں ایک تقریب کی مشترکہ میزبانی کرنے کے بعد جس میں حکومت کی تحریک لبیک پاکستان کے ہفتوں پہ محیط خلل انگیز احتجاج کے سامنے ہتھیار ڈالنے کے حوالے سے بات کی گئی تھی غائب ہو گئے۔ خان مبینہ طور پر جولائی میں واپس گھر آئے۔

انسانی حقوق کی تنظیموں نے اطلاع دی کہ پشتون حقوق کے کارکن اور سندھی اور بلوچی قوم پرست یا تو غائب ہو گئے یا انہیں بغیر وجہ بتائے یا بنا وارنٹ گرفتار کر لیا گیا۔ مثال کے طور پر اپریل میں پروگریسو یوتھ الائنس نے الزام لگایا کہ کراچی میں پشتون حقوق کی مرحلہ وار ریلیوں کے بعد اس کے گیارہ ممبران اغواء کر لئے گئے۔ سندھ کی قوم پرست جماعتوں نے بھی الزام لگایا کہ قانون نافذ کرنے والی ایجنسیوں نے سندھی سیاسی کارکنان کو اغواء کرنے کے بعد قتل کر دیا۔

سال کے ابتدائی چھ ماہ کے دوران، پشتون حقوق کے کارکنوں نے سوشل میڈیا پر گرفتاریوں، جبری گمشدگیوں اور سیکورٹی ایجنسیوں کے ہاتھوں پشتون تحفظ تحریک کے کارکنوں کی مختلف انداز میں خوف و ہراساں کیئے جانے کو اُجاگر کیا۔ جن لوگوں کو زیر حراست لیا گیا وہ اس گروپ کے عہدہ داراں اور ممبران تھے۔ غیر سرکاری تخمینوں کے مطابق، فوج نے تین ہزار ایسے افراد کو رہا کر دیا جن کو پی ٹی ایم کی جبری گمشدگیوں کے خلاف احتجاجی تحریک کے تناظر میں بغیر کسی الزام کے گرفتار کیا گیا تھا اور جن میں سے کچھ کئی برسوں سے زیر حراست تھے۔ مشاہدین کا خیال ہے کہ ارباب اختیار نے ان کو کارکنوں کے دباؤ کے تحت رہا کیا مگر اس عمل نے ان الزامات کو مزید ہوا دی کہ حکام نے زیر حراست لوگوں کے ساتھ بدسلوکی کا مظاہرہ کیا جس سے

جبری گمشدگیوں کو ختم کرنے کے مطالبہ اور زیر حراست افراد کے خلاف قانونی چارہ جوئی یا ان کو رہا کرنے کے لئے مزید شفاف قانونی طریقہ کار اختیار کرنے کے مطالبہ نے مزید زور پکڑا۔

سپریم کورٹ کے سابق جج جسٹس جاوید اقبال اور قانون نافذ کرنے والے ریٹائرڈ اہلکار محمد شفیق ورک کی زیر سربراہی جبری گمشدگیوں کے خلاف قائم کمیشن آف انکوائری کو ۲۰۱۱ء سے ۳۱ اکتوبر تک گمشدہ افراد کے ۵۵۰۷ کیسز موصول ہوئے۔ کمیشن نے ان میں سے ۳۶۳۳ کیسز کو بند کر دیا جبکہ ۱۸۷۴ کو جاری رکھا گیا۔

ج) تشدد اور دیگر وحشیانہ اور غیر انسانی یا ہتک آمیز رویے اور سزائیں

اگرچہ آئین تشدد اور دیگر وحشیانہ، غیر انسانی، اور توہین آمیز طرز عمل کی ممانعت کرتا ہے مگر فوجداری قوانین میں تشدد کے خلاف کوئی مخصوص دفعہ نہیں ہے۔ ایسی رپورٹس بھی ملیں کہ سیکورٹی اداروں بشمول خفیہ اداروں نے اپنی تحویل میں موجود افراد کو تشدد اور بدسلوکی کا نشانہ بنایا۔

اقوام متحدہ کے ہائی کمشنر برائے انسانی حقوق کی تشدد کے خلاف کمیٹی کے مطابق، ۲۰۱۷ء میں ایسی اطلاعات تھیں کہ ریاستی اہلکاروں اور افواج نے وسیع پیمانے پر تشدد کا استعمال کیا۔ انسانی حقوق کے حوالے سے کام کرنے والی تنظیموں نے محسوس کیا کہ حکومت کی طرف سے تشدد کو روکنے کے لئے سنجیدہ کوششوں کی کمی ہے اور دعویٰ کیا کہ تشدد روا رکھنے والے بنیادی طور پر پولیس، فوج اور خفیہ ایجنسیوں کے اہلکار بغیر کسی جوابدہی اور تادیبی کارروائی کے کام کرتے رہے۔ تاہم اگست میں حکام نے اس وقت دو پولیس اہلکاروں کو نوکری سے برطرف کر دیا جب ان کی ایک ایسی وڈیو منظر عام پر آئی جس میں ان کو دو لڑکیوں پر تشدد کرتے ہوئے دکھایا گیا جن پر کسی فحش سرگرمی میں حصہ لینے کا الزام تھا۔

ایسی اطلاعات بھی تھیں کہ پولیس کے اہلکاروں نے سزا کے سفاکانہ اور ہتک آمیز طریقے اپنائے۔ ہیومن رائٹس کمیشن آف پاکستان کے مطابق ۲۰۱۷ء تک کُل رپورٹ ہونے والے ۱۲۷ کیسوں کے مقابلے میں ۶ مئی تک پولیس نے ۵۲ کیسوں میں اپنے اختیارات سے تجاوز کیا۔ متعدد ذرائع کے مطابق بعض اوقات پولیس کی زیادتیاں زیر حراست افراد کی موت یا ان کو آنے والی شدید چوٹوں پر منتج ہوئیں جو اکثر حالات میں چھپا دی گئیں۔ ۱۶ اکتوبر کو پولیس نے سرگودھا (پنجاب) میں ڈاکے کے الزام میں ایک شخص کو گرفتار کیا جو اسی دن انتقال کر گیا اور اس کی دادی نے پولیس کو بتایا کہ اس کی موت پولیس حراست کے دوران تشدد سے واقع ہوئی۔

پولیس کے بعض اداروں نے اس تشدد کو روکنے کے لئے کچھ اقدامات اٹھائے۔ مثال کے طور پر ۲۰۱۷ء میں اسلام آباد وفاقی علاقہ کے انسپکٹر جنرل نے اسلام آباد کے تمام ۲۲ پولیس اسٹیشنوں میں انسانی حقوق کے افسران کی تعیناتی کی تاکہ ان خلاف ورزیوں کو روکا جا سکے۔ پولیس کے متعدد ادارے انسانی حقوق کو اپنے تربیتی نصاب میں شامل کرتے ہیں۔ ۲۰۱۱ء سے پچاس ہزار سے زائد پولیس اہلکار انسانی حقوق سے متعلق تربیت حاصل کر چکے ہیں۔

اگرچہ ملک کے آئین میں ۲۵ ویں ترمیم کے بعد وفاق اور صوبہ کے زیر انتظام قبائلی علاقے (فاٹا اور پاٹا) صوبے میں ضم کر دیئے گئے ہیں اور فرنٹیئر کرائم ریگولیشن (ایف سی آر) مجریہ ۱۹۰۱ء ختم ہو گیا ہے تاہم فاٹا انٹیرم گورننس ریگولیشن (ایف آئی جی آر) جس نے اس کی جگہ لی ہے اپنے اندر ایف سی آر کی زیادہ تر سخت گیر فوجداری دفعات پر مشتمل ہے۔ مثال کے طور پر، حکام اب بھی فرد کے حقوق کو پس پشت ڈالتے ہوئے اجتماعی سزا نافذ کر سکتے

ہیں۔ اجتماعی سزا پر مرحلہ وار عملدرآمد ہوتا ہے جس کے تحت پہلے گھر کے قریبی مرد، اس کے بعد قبیلے کے افراد نشانہ بنتے ہیں۔ انسانی حقوق کی غیر سرکاری تنظیموں نے اجتماعی ذمہ داری کے تصور پر اپنی تشویش کا اظہار کیا ہے چونکہ ارباب اختیار اس کو بھگوڑے شخص کے قبیلے کے ممبران کو نظر بند رکھنے، ان کے گھر مسمار کرنے، ان کی جائیداد پر قبضہ کرنے یا اس کو تباہ کرنے یا ان کے گاؤں کے گھیراؤ کے لئے استعمال کرتے ہیں تاوقتیکہ ملزم کو اپنے قبیلے کی طرف سے مقامی روایت کے مطابق سزا نہ دے دیجائے یا وہ گرفتاری نہ دے۔

۳۰ نومبر تک، پاکستان کے ۵۳۳۹ فوجی اور پولیس اہلکار دنیا بھر میں قیام امن کی سرگرمیوں میں مصروف تھے۔ سال کے دوران، اقوام متحدہ نے جنسی استحصال سے متعلق ایک پاکستانی اہلکار کے خلاف شکایت درج کرائی۔ یہ الزام ۲۰۱۷ء میں واقع ہونے والے ایک کاروباری سیکس سے متعلق کیس سے تھا۔ ایک اور تفتیش جو جون ۲۰۱۱ء میں شروع ہو کر ۲۰۱۲ء میں ایک غیر معینہ تاریخ تک جاری رہنے والے ایک استحصالی جنسی تعلق سے متعلق تھی مزید معلومات کی فراہمی کے سبب دسمبر ۲۸ تک زیر التواء تھی۔ تین دیگر رپورٹوں پر تحقیقات شہادتوں کی عدم دستیابی کی وجہ سے بند کر دی گئیں۔ ان میں سے ایک آئیوری کوسٹ میں تعینات ایک پاکستانی کے خلاف ۲۰۱۴ء میں ایک کم عمر سے زیادتی سے متعلق تھی۔ ایک اور رپورٹ ۲۰۱۷ء میں سامنے آئی جو ۲۰۱۶ء میں ایک جنسی حملہ کی کوشش سے متعلق تھی اور تیسری شکایت یہ تھی کہ پاکستان امن دستوں کے ارکان اگست ۲۰۱۵ء سے مارچ ۲۰۱۶ء تک جنسی کاروبار میں ملوث رہے ہیں۔

جیل اور حوالات کی صورتحال

کچھ سویلین جیلوں اور فوجی حراستی مراکز کی صورتحال انتہائی سخت اور گنجائش سے زیادہ قیدیوں، ناکافی خوراک اور دوائوں اور ناگفتہ بہ حفظان صحت کی صورتحال کی بدولت زندگی کے لئے بہت خطرناک تھی۔

جیلوں کی حالتِ زار: عام طور پر جیلوں کی صورتحال انتہائی خراب تھی۔ گنجائش سے زیادہ افراد کی موجودگی ایک سنگین مسئلہ تھی اور اس کی وجہ فوجداری نظام کے ڈھانچہ میں پائی جانے والی بنیادی خرابیاں تھیں جس کی وجہ سے مقدمے سے پہلے قید کئے جانے والے حوالاتیوں کی ایک بڑی تعداد تھی۔ مئی میں کی جانے والی کرسر آف ڈیولپمنٹ اینڈ ایجوکیشن پاکستان کی تحقیق کے مطابق جو پاکستان کی نیشنل کائونٹر ٹیررازم ایجنسی اور ہلال احمر کی بین الاقوامی کمیٹی کے زیر اہتمام کی گئی یکم اکتوبر ۲۰۱۷ء تک پاکستان بھر کے ۱۱۲ جیلوں میں قیدیوں کی تعداد ۸۴۲۸۷ رہی۔ ان جیلوں کی سرکاری گنجائش ۵۴۰۰۰ افراد پر مشتمل ہے جس کے مطابق سویلین جیلوں میں مکینوں کی رہائش ڈیڑھ گنا تک ہے۔

بنیادی طور پر صوبائی حکومتیں ان جیلوں اور حراستی مراکز کے امور چلانے کی ذمہ دار ہیں۔

اگرچہ ان جیلوں میں فراہم کی جانے والی خوراک کے معیار اور مقدار میں بہتری دیکھنے میں آئی، ناکافی خوراک اور طبی سہولتوں کے فقدان کی وجہ سے پرانے طبی عوارض عام رہے۔ ناکافی غذا ایک مسئلہ بنی رہی خاص طور سے ان قیدیوں میں جو اپنے کنبہ یا دوستوں کی طرف سے اس سلسلے میں کسی مدد سے محروم رہے۔ متعدد جگہوں پر صفائی ستھرائی کا نظام، ہوا کا گزر، روشنی اور پینے کے صاف پانی تک رسائی ناکافی تھے۔ بیشتر جیل پرانی طرز پر بنے ہوئے تھے اور ان میں اندرونی درجہ حرارت کو کنٹرول کرنے کا کوئی نظام موجود نہیں تھا۔ بنیادی اور فوری طبی سہولیات کا ایک نظام تھا، مگر اس تک رسائی دفتری طریقہ کار کی پیچیدگیوں کی وجہ سے دشوار رہی۔ کسی معذوری کا شکار قیدی اکثر دیکھ بھال سے محروم رہے۔ ہیومن کمیشن آف پاکستان

نے ۲۰ مئی تک مختلف جیلوں میں ۲۰ قیدیوں کی تشدد کی وجہ سے ہلاکتوں کی تصدیق کی۔ دنیاٹی وی نیوز پر اپریل میں نشر ہونے والی ایک رپورٹ کے مطابق، پنجاب کی مختلف جیلوں میں ۲۰۱۷ء کے دوران ۱۴۵ قیدی قدرتی اسباب بشمول ایڈز اور یرقان کے سبب انتقال کر گئے۔ ایک سابقہ قیدی جس نے پندرہ سال خیبر پختونخواہ کی جیل میں گزارے پشاور ہائی کورٹ میں درخواست دی کہ وہ صوبے کے تمام قیدیوں کے میڈیکل ٹیسٹ کی ہدایات جاری کرے کیونکہ صرف اس جیل میں جس میں درخواست گزار قید تھا ۱۲ قیدی ایچ آئی وی پازیٹو اور تقریباً ۵۰ قیدی یرقان کا شکار تھے۔ اس قیدی نے یہ بھی درخواست کی کہ صوبے کی جیلوں میں مقید لوگوں کی صحیح تعداد اور وہاں اصل گنجائش کو ظاہر کیا جائے۔ اس نے یہ بھی دعوی کیا کہ جہاں وہ نظر بند ہے وہاں ۱۲۵ افراد کی گنجائش ہے جبکہ اصل میں وہاں پر ۶۴۰ قیدی موجود ہیں۔

عیسائی اور احمدی برادریوں کے نمائندوں کے مطابق ان کی جماعتوں سے تعلق رکھنے والے قیدی اکثر جیل میں دوسرے قیدی ساتھیوں کے ہاتھوں بدسلوکی اور تشدد کا نشانہ بنتے ہیں۔ سول سوسائٹی تنظیموں کے مطابق ایسے ملزمان جن پر توہین مذہب کے الزامات ہوتے ہیں وہ اکثر و بیشتر جیل میں بُرے حالات کا شکار رہتے ہیں۔ غیر سرکاری تنظیموں کے مطابق توہین مذہب کے بیشتر ملزمان کو لمبے عرصہ کے لئے قید تنہائی میں رکھا جاتا ہے جو بعض اوقات ایک سال پر محیط ہوتا ہے۔ جبکہ حکومت کا یہ کہنا ہے کہ ایسا اس ملزم کی حفاظت کے پیش نظر کیا جاتا ہے کیونکہ خدشہ ہوتا ہے کہ ایسے ملزم کو دیگر ملزمان کی جانب سے خطرات درپیش ہوں۔

حکام خواتین قیدیوں کو مرد قیدیوں سے الگ رکھتے ہیں۔ غیر سرکاری تنظیموں نے بتایا کہ مخنثوں کو مرد قیدیوں کے ساتھ رکھا گیا۔ بلوچستان میں خواتین کی کوئی الگ جیل نہیں ہے مگر حکام نے خواتین کو الگ بیرکوں میں مقید رکھا۔

بنیادی ڈھانچہ کی کمی کے سبب، پولیس نے اکثر ملزموں اور مجرموں کو الگ الگ نہیں رکھا اگرچہ پنجاب، سندھ اور خیبر پختونخوا میں اپنے اپنے صوبوں میں نئے جیلوں کے قیام کے سلسلے میں کوشاں رہے جہاں جدید طرز پر قیدیوں کو الگ رکھنے کی سہولت ہو اور جہاں بہت زیادہ رش سے بھی بچا جا سکے۔

جیل کے حکام نے کمسن ملزمان کو بڑوں سے علیحدہ بیرکوں میں رکھا۔ ان کو اور بڑی عمر کے قیدیوں کو سواری کے انتظار کے وقت قریب آنے کا موقع ملتا تاہم اس وقت ان پر کڑی نگرانی رکھی جاتی۔ بچوں کے حقوق کے تحفظ کے لئے قائم تنظیم کے مطابق، قیدی بچے دیگر قیدیوں اور جیل کے عملہ کی جانب سے بدسلوکی، تشدد اور زیادتی کا شکار رہے۔

انتظامیہ: زیر حراست افراد کے امور کی نگرانی کے لئے ایک محتسب کا دفتر اسلام آباد میں اور ذیلی دفاتر ہر صوبہ میں تھے۔ جیل خانہ جات کے انسپکٹرز جنرل نے بے قاعدگی کے ساتھ جیلوں اور زیر حراست مراکز کا دورہ کیا تاکہ صورتحال کو جانچا جا سکے اور شکایات کا ازالہ کیا جا سکے۔

قانون کے مطابق جیل کے حکام پر یہ لازم ہے کہ وہ قیدیوں اور زیر حراست افراد کی جانب سے تحریر کی گئی شکایتیں بغیر سینسر کے عدالتی حکام تک پہنچائیں اور ان سے غیر انسانی صورتحال کے حوالے سے لگائے گئے قابل اعتبار الزامات کی تفتیش کی درخواست کر سکیں۔ تاہم اس قسم کی اطلاعات موصول ہوئیں کہ قیدیوں نے جیل حکام کی جانب سے انتقامی کارروائی کے خوف سے اپنی شکایات جمع کرانے سے احتراز کیا۔ قانون کے مطابق قیدیوں سے ملاقات کی جا سکتی ہے مگر رش اور بعض جیلوں میں ملاقاتیوں کے لئے سہولیات کی عدم فراہمی کی وجہ سے قیدی اپنے ملاقاتیوں سے ملنے کے حوالے سے شدید پابندیوں کا شکار رہے۔ زیادہ تر مواقع پر جیل حکام نے قیدیوں کو اپنی مذہبی روایات کی پاسداری کی اجازت فراہم کی۔

آزادانہ نگرانی: ان بین الاقوامی تنظیموں نے جو جیلوں میں پائی جانے والی صورتحال کی نگرانی پر مامور ہیں بعض حراستی مراکز تک رسائی کے حوالے سے اپنی مشکلات کا اظہار کیا خاص کر ان مراکز تک جہاں ملکی سالمیت سے متعلق قیدی نظر بند تھے۔

حکام نے بین الاقوامی تنظیموں کو خیبر پختونخوا، فاٹا اور بلوچستان میں تشدد آمیز واقعات سے متاثرہ علاقوں میں حراستی مراکز تک رسائی کی اجازت نہیں دی۔ حکام نے مقامی، صوبائی اور قومی سطح پر انسانی حقوق کی تنظیموں اور صحافیوں کو جیلوں میں قید بچوں اور عورتوں کی حالت زار کا معائنہ کرنے کی اجازت دی۔

اصلاحات: موجودہ جیلوں کے ڈھانچے میں بہتری اور نئی حکمت عملیوں کے ساتھ ساتھ نئی سہولیات کی تعمیر کے باعث زیر التواء کیسوں کے ملزمان اور مجرموں کو الگ الگ رکھنے میں اضافہ ہوا ہے۔ جولائی میں حکومت نے سندھ محکمہ جیل خانہ جات کے لئے نئی تربیت گاہ کی تعمیر کا سنگ بنیاد رکھا جس میں جیلوں کے انتظام وانصرام کے بارے میں بڑے پیمانے پر تربیتی پروگرام کرائے جاسکیں گے۔ پنجاب اور سندھ کے صوبوں کی اڑتالیس جیلوں میں اعداد وشمار پر مبنی جیل مینجمنٹ انفارمیشن سسٹم متعارف کرایا گیا جبکہ ۲۰۱۷ء میں پنجاب میں یہ نظام محض سترہ جیلوں تک محدود تھا۔ حکومت نے اقوام متحدہ کے دفتر برائے انسدادِ منشیات وجرائم کے اشتراک سے کمپیوٹرائزڈ اعداد وشمار کے استعمال کو وسعت دینے پر کام کیا تاکہ قیدیوں کا محفوظ اور درست ریکارڈ رکھا جاسکے۔

د) جبری حراست یا گرفتاری

قانون اندھا دھند گرفتاری یا حراست میں لیئے جانے کی ممانعت کرتا ہے اور فرد کو حق دیتا ہے کہ وہ اپنی گرفتاری یا حراست کے جواز کو عدالت میں چیلنج کرے، لیکن حکام عام طوران قواعد وضوابط کی پاسداری نہیں کرتے۔ بدعنوانی اور سزا کے خوف سے مبرا ہونے کے باعث مسئلہ مزید گھمبیر ہو جاتا ہے۔

پولیس کا کردار اور سلامتی کا نظام: ملک کے بیشتر علاقوں میں سلامتی وحفاظت کی بنیادی ذمہ داری پولیس کی ہے۔ مقامی پولیس صوبائی حکومتوں کے ماتحت ہے۔ پولیس کے وسائل اور کارکردگی مختلف اضلاع میں مختلف ہے اور بعض جگہوں پر یہ ادارہ باوسائل اور موثر ہے اور بعض علاقوں میں بے سروسامانی کی کیفیت ہے اور کارکردگی غیر موثر ہے۔ نیم فوجی تنظیموں میں جن میں بلوچستان اور خیبر پختونخوا اور سابقہ فاٹا کے علاقوں میں سرگرم فرنٹیئر کور اور سندھ اور پنجاب میں رینجرز وزارت داخلہ کے ماتحت سلامتی کی خدمات سرانجام دیتی ہیں۔ فرنٹیئر کور حالت امن میں وزارت داخلہ کو اور حالت جنگ میں فوج کو جواب دہ ہوتی ہے۔ مسلح افواج بیرونی حفاظت کی ذمہ دار ہیں، تاہم داخلی سلامتی کے محاذ پر بھی اپنا کردار جاری رکھے ہوئے ہیں۔

سال کے وسط میں ملکی آئین میں کی گئی ۲۵ ویں ترمیم کے ذریعہ وفاقی اور صوبائی زیر انتظام قبائلی علاقوں کو صوبہ خیبر پختونخوا کا باقاعدہ حصہ بنادیا گیا جس سے قبائلی علاقہ جات ملک کے سیاسی اور آئینی دھارے میں شامل ہوگئے۔ فاٹا عبوری حکومتی قوانین (ایف آئی جی آر) نے ان علاقوں میں امن وامان کے قوانین کے طور پر فرنٹیئر کرائمز ریگولیشنز (ایف سی آر) کی جگہ لے لی۔ ایف سی آر کی طرح ایف آئی جی آر پر بھی ڈپٹی کمشنرز (سابقہ پولیٹیکل ایجنٹس) کے ذریعہ نفاذ کیا جاتا ہے اور وہ خیبر پختونخوا کے گورنر کو جواب دہ ہوتے ہیں۔ ۲۵ ویں آئینی ترمیم کے ذریعہ یہ سابقہ قبائلی علاقے پشاور ہائی

کورٹ اور سپریم کورٹ کی عملداری میں آ گئے ہیں لیکن سال کے اواخر تک یہ نیا نظام مکمل طور پر نافذ العمل نہیں ہو سکا۔ ایف آئی جی آر کے تحت قبائلی عمائدین کی کونسل (عام طور پر جرگہ کے نام سے موسوم ہے جو مقامی رہنماؤں پر مشتمل ہوتا ہے اور اتفاق رائے سے فیصلہ کرتا ہے) قبائلی رہائشیوں کو وکیل کی خدمات حاصل کرنے کا حق نہیں دیتی۔ اگر ملزم ایک بالغ شخص ہے، تو وہ کیس میں اپنا دفاع کرنے کے لیئے عمائدین کی کونسل میں ذاتی طور پر پیش ہوتا ہے۔ والدین اپنے نابالغ بچوں اور مرد حضرات اپنی خواتین رشتہ داروں کی جانب سے پیش ہوتے ہیں۔ مبصرین نے ایف سی آر اور ایف آئی جی آر کو سخت شقوں کے باعث تنقید کا نشانہ بنایا۔

صوبہ خیبر پختونخوا میں انضمام کے بعد سابقہ فاٹا میں پولیس نے نیم فوجی فورسز کے ساتھ کام کرنا شروع کر دیا ہے۔ ان سابقہ قبائلی علاقوں میں نیم فوجی فورسز میں فرنٹیئر کور، فرنٹیئر کانسٹیبلری، "خاصہ دار" (وراثتی قبائلی پولیس) اور فاٹا لیویز فورس شامل ہیں جو ڈپٹی کمشنرز (ہر قبائلی ایجنسی میں تعینات کئے گئے انتظامی سربراہ) کو جواب دہ ہوتی ہیں۔ قبائلی رہنما امن وامان کی کسی عارضی صورت حال سے نمٹنے کے لیئے "لشکر" (قبائلی ملیشیا) بلاتے ہیں لیکن یہ لشکر نجی ملیشیا کے طور پر کام کرتے ہیں، باقاعدہ قانون نافذ کرنے والے ادارے کے طور پر نہیں۔ پختونخوا کی صوبائی پولیس سابق فاٹا تک اپنے دائرہ کار بڑھانے کے سلسلہ میں اضافی اہلکاروں کی بھرتی اور تربیت کے عمل میں مصروف ہے۔

سول حکام کی زیادتیوں پر سزاؤں میں ناکامی سے ملک بھر میں لاپرواہی کے ماحول نے فروغ پایا۔ سول سوسائٹی کے ذرائع کے مطابق پولیس اور جیل حکام اکثر اوقات قیدیوں اور ان کے خاندان والوں سے پیسے اینٹھنے کے لیئے زیادتیوں کی دھمکیاں دیتے ہیں۔ انسپکٹر جنرل، ڈسٹرکٹ پولیس، ضلعی ناظمین (مقامی حکومت کا منتخب سربراہ)، صوبائی وزیر داخلہ، چیف سیکریٹری، وفاقی وزیر داخلہ، وزیر اعظم یا عدالت انسانی حقوق کی پامالی کی تحقیقات کا حکم دے سکتے ہیں اور انضباطی کارروائی کر سکتے ہیں۔ انتظامیہ اور پولیس حکام فوجداری کارروائی کی سفارش اور عدالت حکم دے سکتی ہے۔

سیکورٹی فورسز کی جانب سے انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کی تحقیقات کا صرف ایک ذریعہ ہے اور وہ ہے عدالتی نظام۔ نیشنل کمیشن فار ہیومن رائٹس (این سی ایچ آر) ۲۰۱۵ء میں قائم کیا گیا خفیہ ایجنسیوں کے خلاف شکایات کی انکوائری نہیں کرا سکتا اور اس پر لازم ہے کہ وہ ایسی شکایات متعلقہ مجاز اتھارٹی کو بھجوائے۔ این سی ایچ آر مسلح افواج کے خلاف کی گئی کسی شکایت پر قومی حکومت سے رپورٹ طلب کر سکتا ہے اور رپورٹ موصول ہونے پر یا تو کارروائی ختم کر سکتا یا پھر مزید کارروائی کے لیئے قومی حکومت کو کیس بھجوا سکتا ہے۔

رپورٹ کے سال کے دوران میں وفاقی حکومت داخلی سلامتی کی صورت حال کو بہتر بنانے کے لیئے فوج اور نیم فوجی اداروں کو بروئے کار لاتی رہی۔ نیم فوجی فورسز، بشمول رینجرز اور فرنٹیئر کانسٹیبلری اسلام آباد کے بعض علاقوں میں حفاظت وسلامتی کی ذمہ داریاں نبھا رہی ہیں اور کراچی میں فعال کارروائیوں میں مصروف ہیں۔ ملک بھر میں جاری عسکریت پسندوں کے خلاف فوج کی زیر قیادت آپریشن ردالفساد میں سول اور فوجی اداروں میں تعاون موجود ہے۔

جنوری ۲۰۱۵ء میں پشاور آرمی پبلک اسکول پر دسمبر ۲۰۱۴ء حملے کے جواب میں پارلیمان نے ایک آئینی ترمیم منظور کی جس کے نتیجے میں فوجی عدالتیں قائم کی گئیں جنہیں دہشت گردی، عسکریت پسندی، فرقہ وارانہ تشدد اور دیگر الزامات میں غیر فوجی شہریوں پر مقدمات چلانے کا اختیار دیا گیا ہے۔

فوجی عدالتوں کو شہریوں پر مقدمہ چلانے کا اختیار جنوری ۲۰۱۷ء تک دیا گیا تھا، لیکن پارلیمان نے اس مدت میں جنوری ۲۰۱۹ء تک توسیع کر دی۔ سول سوسائٹی کے ارکان نے شہریوں پر فوجی عدالتوں میں مقدمات چلانے پر تشویش کا اظہار کیا اور شفافیت کی عدم موجودگی اور سول عدالتی نظام پر عدم اعتماد کو وجوہات قرار دیا۔

پولیس مذہبی اقلیتوں بشمول احمدیوں، مسیحیوں، شیعہ مسلمانوں اور ہندوؤں کو حملوں سے بچانے میں اکثر ناکام رہی۔ مسیحی، پارسی اور ہندوؤں کے کارکنوں نے بتایا کہ اُن کے بیشتر لوگ قانون نافذ کرنے والے اداروں پر بھروسہ نہیں کرتے۔ انہوں نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا کہ ان کی کمیونٹی کے افراد جرائم کی رپورٹ درج کرانے سے گریز کرتے ہیں کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ پولیس نے کوئی کارروائی نہیں کرنی۔ انہوں نے قانون نافذ کرنے والے اہلکاروں پر الزام لگایا کہ وہ اقلیتوں کے ساتھ درشتی سے پیش آتے ہیں اور مثال دیتے ہوئے کہا کہ کس طرح پولیس نے کراچی کی ایک آبادی میں عیسائی رہائشیوں کو مئی کے مہینے میں اجتماعی سزا دی جب ایک مسیحی باشندے نے ایک انٹیلی جینس ادارے کے افسر کے خلاف جرم کا ارتکاب کیا تھا۔ پولیس نے بلا اجازت ان لوگوں اور ان کے گھروں کی تلاشی لی، بلا تفریق متعدد مسیحی باشندوں کو گرفتار کر لیا اور ملزم کو گرفتاری کے لیئے پیش نہ کرنے کی صورت میں پوری مسیحی آبادی کو جسمانی اور قانونی سزا دینے کی دھمکی دی۔

پولیس کے محکموں کو تربیت کے ذریعہ بشمول انسانی حقوق کی پاسداری، پیشہ ورانہ اور جدید خطوط پر استوار کرنے کا سلسلہ جاری رہا۔ بعض مقامی حکام نے اپنی جانوں پر کھیل کر اقلیتوں کو امتیازی سلوک اور ہجوم کے ہاتھوں مار پیٹ سے بچانے میں اپنی اہلیت اور آمادگی کا مظاہرہ کیا۔

گرفتاری کا طریقہ کار اور زیر حراست افراد سے سلوک

ایک ایف آئی آر کسی بھی گرفتاری کی قانونی بنیاد ہوتی ہے اور یہ اس وقت شروع ہوتی ہے جب پولیس کو کسی قابل دست اندازی جرم کی اطلاع ملتی ہے۔ عام طور پر ایک تیسرا فریق ایف آئی آر کا اندراج کراتا ہے، تاہم پولیس بھی اپنے طور پر ایف آئی آر درج کر سکتی ہے۔ ایف آئی آر کی بنیاد پر پولیس ایک مشتبہ شخص کو چوبیس گھنٹے کے لیئے حراست میں لے سکتی ہے، جس کے بعد ایک مجسٹریٹ مزید ۱۴ روز کی حراست کا حکم دے سکتا ہے بشرطیکہ پولیس یہ ثابت کرے کہ معاملہ کی چھان پھٹک کے لیئے شواہد درکار ہیں۔ بعض حکام حراست کی اس پابندی کا اہتمام نہیں کرتے۔ حکام مبینہ طور پر معاون شواہد کے بغیر ایف آئی آر درج کر لیتے ہیں تاکہ زیر حراست افراد کو خوف اوہراساں کریں یا کافی شواہد کی موجودگی میں بھی اس وقت تک ایف آئی آر درج نہیں کرتے جب تک وہ مدعی سے رشوت نہ وصول کر لیں۔ ایسی بھی اطلاعات تھیں کہ لوگوں کو بغیر عدالتی اجازت کے گرفتار کیا گیا اور قیدیوں سے ملاقات کے لیئے رشوت دینا پڑی۔

وزارت داخلہ نے غیر ملکی باشندوں کی گرفتاری کے متعلق اطلاع معمول کے مطابق سفارتخانوں اور قونصل خانوں کو نہیں دی۔ ۲۰۱۵ء میں حکومت نے غیر ملکی مشنوں کو پابند کرنا شروع کیا کہ وہ اپنے زیر حراست باشندوں تک رسائی کے لیئے بیس دن قبل درخواست دیں۔ کئی غیر ملکی مشنوں نے اطلاع دی کہ زیر حراست باشندوں تک رسائی کی درخواستیں ہفتوں بلکہ مہینوں تک زیر التواء پڑی رہتی ہیں اور شنوائی نہیں ہوتی۔ غیر ملکی قیدی اپنی قید مکمل کرنے کے بعد بھی جیلوں میں پڑے سڑتے رہتے ہیں کیونکہ وہ ملک بدری کے لیئے اخراجات برداشت نہیں کر سکتے۔

قیدیوں کی رہائی کے لیئے ضمانتوں کا ایک باقاعدہ نظام موجود ہے۔ تاہم انسانی حقوق کے گروہوں نے نوٹ کیا کہ متعدد بار جج رشوت کی وصولی تک ضمانت پر رہائی منظور نہیں کرتے۔ غیر سرکاری تنظیموں نے اطلاع دی کہ حکام توہین رسالت کے کیسوں میں اس بنیاد پر ضمانت منظور نہیں کرتے کہ مدعاعلیہ جسے سزائے موت کا سامنا ہوتا ہے فرار ہو جائے گا یا لوگوں کے غیض وغضب کا شکار ہو جائے گا۔ وہ مدعاعلیہ جو کم تر درجے کے توہین رسالت الزامات کا سامنا کر رہے ہوتے ہیں، ان پر ساتھ ساتھ دہشت گردی کے الزامات بھی عائد کر دیئے جاتے ہیں جو کہ ناقابل ضمانت ہوتے ہیں۔ غیر سرکاری تنظیموں نے یہ بھی اطلاعات دیں کہ وہ وکلاء جو توہین رسالت کے ملزمان کی نمائندگی کر رہے ہوتے ہیں اپنے موکلان کو مشورہ دیتے ہیں کہ وہ زیر حراست رہیں تاکہ لوگوں کے غیض وغضب سے محفوظ رہ سکیں۔ انسدادِ دہشت گردی کی عدالتوں میں یا پھر فوجی عدالتوں میں جنہیں ۲۰۱۵ء کی آئینی ترمیم کے تحت قائم کیا گیا ہے، ضمانت نہیں ہو سکتی۔

حکومت سزائے موت کا سامنا کرنے والے قیدیوں کو سرکار کے خرچے پر قانونی مشاورت فراہم کرتی ہے لیکن یہ قانونی سہولت دیگر کیسوں میں میسر نہیں ہے۔ آئین حبسِ بے جا کے خلاف حق کو تسلیم کرتا ہے اور ہائی کورٹس کو اختیار دیتا کہ وہ زیر حراست مشتبہ شخص کو عدالت میں پیش کرنے کا حکم دیں۔ قانون شہریوں کو اجازت دیتا کہ وہ حبس بے جا کی درخواستیں عدالتوں میں دائر کریں۔ جبری گمشدگیوں کے متعدد کیسوں میں سرکاری حکام ججوں کے حکم پر زیر حراست افراد کو عدالت میں پیش کرنے میں ناکام رہے۔

اندھا دھند پکڑ دھکڑ: ایسی اطلاعات تھیں کہ پولیس اندھا دھند افراد کو گرفتار کر لیتی ہے تاکہ اُن سے رہائی کے عوض رشوت وصول کی جائے یا مطلوب ملزمان کے رشتہ داروں کو پکڑ لیتی ہے تاکہ ان ملزمان کو گرفتاری دینے کے لیئے مجبور کیا جا سکے۔ کراچی میں روہنگیا باشندوں نے، جن کے پاس شناخت کی سرکاری دستاویزات نہیں ہوتیں، اطلاع دی کہ پولیس اہلکار انہیں زبردستی پکڑ لیتے ہیں اور ہراساں کرتے ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ پولیس، بشمول فیڈرل انوسٹی گیشن ایجنسی کے اہلکار رشوت وصول کرنے کے لیئے پکڑ دھکڑ کرتے ہیں۔

گرفتاری قبل از سماعت مقدمہ: کرسر فار ڈویلپمنٹ اینڈ ایجوکیشن (کوڈ) کی ایک رپورٹ کے مطابق، جو مئی کے مہینہ میں شائع ہوئی، ۶۶ فی صد قیدی یکم اکتوبر ۲۰۱۷ء تک یا تو اپنے مقدمات شروع ہونے کے منتظر تھے، یا پھر زیر التواء مقدمات میں بند تھے۔ "کوڈ" کے مطابق پاکستان میں جیل حکام اعداد و شمار جمع کرنے کے سلسلہ میں مقدمات شروع ہونے کے منتظر اور زیر التواء مقدمات کے قیدیوں میں کوئی تفریق نہیں کرتے۔ پولیس بسا اوقات افراد کو مجسٹریٹ کی منظوری کے بغیر تفتیش کے لیئے لوگوں کو حراست میں لے لیتی ہے اور انہیں بغیر کسی الزام کے قید میں رکھتی ہے یہاں تک کہ یہ حراست عدالت میں چیلنج ہو جاتی ہے۔ مجسٹریٹس بھی عام طور پر پولیس کی درخواست پر بغیر کسی جواز کے تفتیش کی غرض سے کی جانے والی گرفتاری کی منظوری دے دیتے ہیں۔ پولیس جب چودہ دن کے اندر مشتبہ شخص کے خلاف مناسب شواہد جمع کرنے میں ناکام رہتی ہے تو وہ عام طور پر مجسٹریٹس سے نئی ایف آئی آر درج کرنے کی درخواست کرتی ہے تاکہ مشتبہ شخص کی حراست کی مدت کو طول دیا جا سکے۔

قانون کی رُو سے زیر حراست افراد کو گرفتاری کے تیس دنوں کے اندر اندر مقدمہ کی کارروائی کے لیئے پیش کرنا لازم ہے۔ چند استثنایات ہیں: ڈسٹرکٹ کوآرڈی نیشن آفیسر "امن وامان" برقرار رکھنے کے لیئے ۹۰ دن تک زیر حراست رکھنے کا مجاز ہے اور یہ مدت محکمہ داخلہ کی منظوری سے مزید ۹۰ دنوں تک بڑھائی جا سکتی ہے۔

بعض کیسوں میں ایف آئی آر کے اندراج کے چھے مہینے بعد تک مقدمے کی سماعت شروع نہ ہوئی اور بسا اوقات تو متعدد افراد کی مقدمے کی سماعت سے قبل حراست کی مدت تو اس جرم میں زیادہ سے زیادہ سزائے قید سے بھی بڑھ گئی جس کا ان پر الزام تھا۔ حکام شاذونادر ہی زیر حراست افراد کو فوری طور پر انہیں ان الزامات کے بارے میں بتاتے ہیں جن میں گرفتار کیا گیا ہوتا ہے۔

قومی احتساب بیورو (نیب) کی جانب سے عدالت میں لائے گئے کیسوں پر خصوصی قواعد وضوابط کا اطلاق ہوتا ہے جو بدعنوانی کی کیسوں کی تحقیق اور پیروی کرتی ہے۔ نیب مشتبہ شخص کو بغیر الزام عائد کئے پندرہ دنوں کے لئے حراست میں رکھ سکتا ہے (اس مدت کی عدالت کی اجازت سے تجدید کی جاسکتی ہے) اور فرد جرم عائد کرنے سے پہلے وکیل تک رسائی سے بھی انکار کیا جاسکتا ہے۔ نیب کے دائرہ کار میں آنے والے جرائم قابل ضمانت نہیں ہیں اور صرف نیب کا چیئرمین ہی اس بات کا فیصلہ کرنے کا مجاز ہے کہ آیا زیر حراست افراد کو رہا کیا جائے۔

سابقہ فاٹا میں، فاٹا عبوری حکومتی قوانین (ایف آئی جی آر) کے تحت ڈپٹی کمشنر مختلف الزامات کی بنیاد پر لوگوں کو حفاظتی تحویل میں لے سکتا ہے اور ناپسندیدہ سرگرمیوں میں ملوث ہونے سے روکنے کے لیئے مچلکے جمع کرانے کی پابندی عائد کر سکتا ہے۔ غیر معینہ مدت کے لیئے حراست کی اجازت نہیں اور زیر حراست افراد ایک ٹریبونل میں اپیل دائر کر سکتے ہیں۔ قیدیوں کو غلط سزا کے خلاف ہرجانے کا دعویٰ کرنے کا حق ہے۔ کیسوں کا ایک مخصوص مدت میں فیصلہ ہونا ضروری ہے اور حکام گرفتار شدہ افراد کو ضمانت پر رہا کر سکتے ہیں۔ قواعد کی رُو سے زیر حراست افراد کو ۲۴ گھنٹوں کے اندر اندر ایف آئی جی آر حکام کے سامنے پیش کیا جانا ضروری ہے جس کی وجہ سے ڈپٹی کمشنرز کی اندھا دھند گرفتاریوں اور کسی بھی فرد کو تین سال تک زیر حراست رکھنے کی صلاحیت میں کمی آئی ہے۔ ملزم کے پاس دو سطحوں پر اپیل کرنے کا حق ہے: پہلی اپیل کمشنر یا ایڈیشنل کمشنر سے کی جاسکتی ہے، جبکہ دوسری اپیل پشاور کی عدالت عالیہ میں کی جاسکتی ہے جو ایف آئی جی آر کے تحت اپیل کا سب سے اعلیٰ فورم ہے۔

صوبہ خیبر پختونخوا (بشمول سابقہ قبائلی علاقہ جات) میں سیکورٹی فورسز مشتبہ دہشت گردوں کی سرگرمیوں کو محدود کر سکتی ہیں، ان کے اثاثے ۴۸ گھنٹوں تک اپنی تحویل میں لے سکتی ہیں اور بغیر کسی الزام کے ایک سال تک حراست میں رکھ سکتی ہیں۔ انسانی حقوق اور بین الاقوامی تنظیموں نے اطلاع دی ہے کہ سیکورٹی فورسز نے کئی افراد کو، جن کی تعداد معلوم نہیں، ان کے دہشت گردوں سے مبینہ تعلقات کی بنیاد پر، غیر معینہ مدت کے لیئے حراست میں رکھا ہوا ہے، جہاں ان پر تشدد کیا جاتا ہے اور بدسلوکی بھی روا رکھی جاتی ہے۔ متعدد کیسوں میں قیدیوں کو قید تنہائی میں رکھا گیا ہے اور انہیں اپنی مرضی کے وکیل تک فوری رسائی بھی نہیں دی گئی۔ ان کے اہل خانہ کو بھی ان سے فوری طور پر ملنے کی اجازت نہیں ہے۔

۲۰۱۱ء ایکشن اِن ایڈ آف سول پاور ریگولیشن (۲۰۰۸ء سے نافذ العمل) کے تحت فوجی قانونی اتھارٹی سابقہ فاٹا اور پاٹا میں سول حکومت کی جانب سے بلائے جانے کی صورت میں مشتبہ دہشت گردوں کو حراست میں لے سکتی ہے۔ ناقدین اسے آئین کی خلاف ورزی قرار دیتے ہیں کیونکہ اس میں فوجی اتھارٹی زیادہ بااختیار بنائی گئی ہے اور قانونی طریقہ کار سے گریز کیا گیا ہے۔ اس قانون کی رُو سے زیر حراست افراد کو باقاعدگی کے ساتھ حراستی مراکز میں بھیجا جاتا رہا۔

زیر حراست افراد کا اپنی گرفتاری کے جواز کو عدالت چیلنج کرنے کا حق: ایسی اطلاعات ملیں کہ زیر حراست افراد یا قیدیوں کو اپنی گرفتاری کو عدالت میں چیلنج کرنے، انصاف حاصل کرنے یا ہرجانہ وصول کرنے کی اجازت نہیں دی گئی۔

ہ) منصفانہ عوامی عدالتی کارروائی کے حق سے انکار

قانون ایک خود مختار عدلیہ کی اجازت دیتا ہے لیکن غیر سرکاری تنظیموں اور ماہرین قانون کے مطابق عدلیہ اکثر اوقات بیرونی دباؤ کے تحت ہوتی ہے جیسا کہ دہشتگردی اور توہین مذہب کے کیسوں میں انتہاپسندوں کی جانب سے انتقام کا خوف اور بڑے بڑے مقدمات کو عوامی طور پر سیاسی رنگ دینے کی روش۔ سول سوسائٹی کی تنظیموں نے اطلاع دی کہ جج حضرات توہین مذہب کے کیسوں میں ملزمان کو عوامی تشدد کے خدشہ کے پیشہ نظر بری کرنے میں تامل کرتے تھے۔ تاہم میڈیا اور عام لوگ ہائی کورٹس اور سپریم کورٹ پر بھروسہ کرتے ہیں۔

ماتحت اور اعلیٰ عدالتوں میں بڑے پیمانے پر پرانے زیر التواء کیسوں کی بھرمار سے موثر ازالے اور جائز عام سماعت کا حق متاثر ہوتا ہے۔ از کار رفتہ قواعد وضوابط، ججوں کی خالی اسامیاں، مقدمات کا غیر معیاری انتظام اور کمزور قانونی تعلیم دیوانی اور فوجداری مقدمات میں تاخیر کا باعث بنتی ہیں۔ لاہور ہائی کورٹ نے عدلیہ کی کارکردگی کو بہتر بنانے کے لیئے اقدامات کئے۔ ۲۰۱۷ء میں عدالت کے چیف جسٹس نے ہڑتالوں کو کم کرانے کے لیئے قانونی اصلاحات متعارف کرائیں اور مسائل کے حل کے متبادل نظام کو باقاعدہ شکل دی۔ اس متبادل نظام کو ۱۲ اکتوبر تک سولہ ہزار دس مقدمات موصول ہوئے اور ان میں سے چار ہزار آٹھ سو پچاسی معاملات حل ہوئے۔

سپریم کورٹ اور ہائی کورٹوں کی کا دائرہ کار متعدد علاقوں تک نہیں بڑھایا گیا جہاں علیحدہ عدالتی نظام کام کر رہے ہیں۔ مثال کے طور پر آزاد کشمیر کا اپنا منتخب صدر، وزیر اعظم، مقننہ اور عدالتی نظام ہے۔ گلگت۔ بلتستان کا الگ عدالتی نظام ہے۔

بہت سی ماتحت عدالتیں بدستور بدعنوان، نااہل رہیں اور دولت مند افراد اور بارسوخ مذہبی اور سیاسی شخصیات کے دباؤ کا شکار تھیں۔

ایسے بھی واقعات سامنے آئے جن میں نامعلوم افراد نے اہمیت کے حامل مقدمات میں گواہوں، وکلاء یا تفتیشی پولیس افسران کو دھمکیاں دیں یا انہیں قتل کر ڈالا۔ ۱۴ اپریل کو بلوچستان پولیس کے تین اہلکاروں نے عصمت دری کا نشانہ بننے والی ایک عورت کو اپنے الزامات واپس لینے کے لیئے دباؤ ڈالا حالانکہ طبی معائنے سے متاثرہ فریق کے الزامات کی تصدیق ہو گئی تھی۔

غیر رسمی عدالتی نظام کا، جس میں قانونی ادارے کا تحفظ نہیں ہوتا، استعمال بالخصوص دیہی علاقوں میں، بدستور جاری رہا اور اکثر اوقات انسانی حقوق کی پامالی کی صورت میں نکلا۔ سندھ اور پنجاب میں بڑے بڑے جاگیرداروں اور سربرآوردہ رہنماؤں اور پختون اور بلوچ علاقوں میں قبائلی قائدین نے کئی بار پنچائیت اور جرگے منعقد کئے جو کہ مروجہ قانونی نظام سے باہر ہیں۔ ایسے اجتماعات نے تنازعات حل کرائے اور قبائلی سزائیں دیں جن میں جرمانے، قید وبند اور بعض دفعہ موت کی سزا بھی شامل تھیں۔ ایسے اجتماعات نے اکثر اوقات نام نہاد غیرت کے نام پر ہونے والے جرائم میں عورتوں کو پُر تشدد سزائیں یا موت کی سزا سنائی۔ سابقہ قبائلی علاقوں میں ایسے اجتماعات فاٹا عبوری حکومتی قوانین یا ایف سی آر کے رہنما اصولوں کی روشنی میں منعقد کرائے گئے۔ اسسٹنٹ کمشنرز (جو قبل ازیں اسسٹنٹ پولیٹیکل ایجنٹس کہلاتے تھے) اپنے من پسند قبائلی رہنماؤں کی اعانت سے پرانے قبائلی علاقوں میں عدل وانصاف کے ذمہ دار ہیں، اسلامی قوانین اور قبائلی رسم ورواج کی اپنی تشریح کے مطابق مقدمات کی سماعت کرتے رہے۔

مقدمات کی سماعت کا طریقہ کار

دیوانی، فوجداری اور فیملی کورٹ کے نظاموں میں انصاف پر مبنی مقدمات کی سماعت کا طریقہ کار موجود ہے جس میں ملزم جرم ثابت ہونے تک بے گناہ تصور کیا جاتا ہے، جرح اور اپیل کا طریقہ کار موجود ہے۔ جیوری کے ذریعہ مقدمات کی سماعت کا نظام نہیں۔ اگرچہ مدعاعلیہ کو سماعت کے دوران موجود رہنے اور وکیل سے مشاورت کا حق ہے، عدالتیں سزائے موت کا سامنا کرنے والے نادار قیدیوں کے لیئے سرکاری وکیل مقرر کرتی ہیں۔ مدعاعلیہ عام طور پر ماتحت عدالتوں میں وکیلوں کی فیس برداشت کرتے ہیں، لیکن اپیلٹ کورٹس میں سرکاری خرچے پر وکیل کی خدمات مہیا کی جاسکتی ہیں۔ مدعاعلیہ استغاثہ کے گواہوں سے جرح کر سکتا ہے اور اپنے گواہ اور شواہد پیش کر سکتا ہے۔ ججوں کی محدود تعداد کے باعث زیر التواء مقدمات کی بھرمار، طویل عدالتی طریقہ کار، بار بار التواء اور سیاسی دباؤ کی وجہ سے کیس عام طور پر برسوں چلتے رہتے ہیں اور مدعاعلیہ کو بار بار عدالت میں پیش ہونا پڑتا ہے۔

بچوں کے حقوق کی تنظیم سوسائٹی فار دی پروٹیکشن آف دی رائٹس آف دی چائلڈ نے مشاہدہ کیا ہے کہ پولیس بچوں کے معمولی جرائم سے مناسب طریقے سے نمٹنے کی تربیت سے عاری ہیں۔ تنظیم نے پولیس کے ہاتھوں نوعمر قیدیوں پر تشدد کی اطلاعات بھی دیں۔ بہت سے نوعمر قیدیوں نے اپنی مدت قید سے زیادہ وقت سلاخوں کے پیچھے گزارا کیونکہ وہ ضمانت کے اخراجات برداشت نہیں کر سکتے تھے۔

مئی کے مہینہ میں پارلیمان نے جووینائل جسٹس سسٹم ایکٹ منظور کیا جس نے جووینائل جسٹس سسٹم آرڈیننس مجریہ ۲۰۰۰ء کی جگہ لی ہے۔ نئے قانون جووینائل کورٹس اور جووینائل جسٹس کمیٹیز تشکیل دینے کی اجازت دیتا ہے تاکہ معمولی جرائم میں ملوث نوعمر قیدیوں کو باقاعدہ عدالتوں میں لے جائے بغیر مقدمات کا فیصلہ کیا جائے۔ اس ہدایت کے باوجود کہ یہ عدالتیں اور کمیٹیاں متذکرہ قانون منظور ہونے کے تین مہینوں کے اندر اندر تشکیل دی جائیں، ۲۸ نومبر تک حکومت نے اس سلسلہ میں کوئی پیش رفت نہیں کی۔

نئے اور پرانے قانون جووینائل جسٹس سسٹم آرڈیننس مجریہ ۲۰۰۰ء بچوں کو سزائے موت پر پابندی عائد کرتا ہے، تاہم بچوں کو انسداد دہشت گردی ایکٹ کے تحت سزائے موت سنائی گئی۔ مزید براں دستاویزات کی عدم موجودگی کے باعث نوعمر ملزمان کی عمر کا تعین کا مسئلہ درپیش رہا۔

عدالتی مقدمات میں شفافیت کی کمی کے واقعات سامنے آئے، بالخصوص جب کسی مقدمہ میں کوئی بڑی شخصیت ملوث ہو یا پھر حساس معاملات جیسا کہ توہین مذہب کا معاملہ درپیش ہو۔ غیر سرکاری تنظیموں نے اطلاعات دیں کہ حکومت اکثر اوقات ایسے مقدمات کی سماعت مدعاعلیہ، وکلاء، ججوں، استغاثے کے وکیل اور عینی شاہدین کے تحفظ کی خاطر جیل کے اندر کرتی ہے۔ اگرچہ سلامتی کے یہ خدشات جائز ہیں، غیر سرکاری تنظیموں نے جیلوں میں سماعت میں عدم شفافیت اور مدعاعلیہ کی اپنے وکلاء کے ساتھ مشاورت میں تخلیئے کی عدم موجودگی پر تشویش کا اظہار کیا ہے۔

انسداد دہشت گردی ایکٹ حکومت کو دہشت گردی کی سرگرمیوں اور فرقہ وارانہ تشدد میں ملوث افراد کے مقدمات کو انسداد دہشت گردی کی خصوصی عدالتوں میں چلانے کی اجازت دیتا ہے۔ دیگر عدالتوں میں مشتبہ افراد کو گرفتاری کے سات دنوں کے اندر اندر پیش کیا جاتا ہے لیکن انسداد دہشت گردی کی عدالتیں یہ مدت بڑھانے میں آزاد ہیں۔ انسانی حقوق کے کارکنوں نے اس متوازی نظام پر نکتہ چینی کی کہ یہ سیاسی ساز باز اور جوڑ توڑ کا شکار ہو سکتا ہے۔ ریسرچ سوسائٹی آف انٹرنیشنل لاء کی فروری کی رپورٹ کے مطابق بعض اوقات حکام سیاست دانوں اور میڈیا کے دباؤ میں ہوتے ہیں کہ ایسے کیسوں کو جلد از جلد چلایا جائے تو ان کیسوں کو انسداد دہشت گردی کی عدالتوں کو منتقل کر دیا جاتا ہے اگرچہ ان کا دہشت گردی

سے تعلق نہ بھی ہو۔ انسداد دہشت گردی کی عدالتوں کا بار بار استعمال کی وجہ سے مقدمات کا انبار لگ جاتا ہے اور معمول کے عدالتی نظام سے تیز تر ہونے کے باوجود انسداد دہشت گردی کی عدالتیں سرسری سماعت کے پیمانے پر پورا اترنے میں اکثر اوقات کامیاب نہ ہو سکیں۔

حکومت دہشت گردی اور دیگر ملتے جلتے الزامات میں شہریوں پر مقدمات چلانے کے لیئے فوجی عدالتوں کو بروئے کار لاتی رہی۔ فوجی عدالتوں میں سماعت عام نہیں ہوتی۔ (سیکشن اول کا "د" بھی ملاحضہ کریں)

فیڈرل شریعت کورٹ عام طور پر حدود آرڈیننس کے تحت فیصلہ کئے گئے مقدمات پر نظر ثانی کرتی ہے۔ یہ قانون فوجی حکمران محمد ضیاء الحق نے ۱۹۷۹ء میں نافذ کیا تھا تاکہ اسلامی قانون کی غیر ازدواجی جنسی تعلق، قذف (غیر ازدواجی جنسی تعلق کا جھوٹا الزام)، چوری اور شراب نوشی کی سزاؤں کی سخت تشریح کا نفاذ کیا جائے۔ اگر ایک صوبائی ہائی کورٹ حدود کیس میں اپیل سننے کا فیصلہ کرتی ہے تو شریعت کورٹ کے پاس صوبائی ہائی کورٹ کے فیصلے پر نظر ثانی کا اختیار نہیں ہے۔ سپریم کورٹ صوبائی ہائی کورٹ کے فیصلے پر نظر ثانی کے لیئے شریعت اپیلٹ بینچ سے ہٹ کر ایسے اپیل والے مقدمات میں اختیار سنبھال سکتی ہے۔ فیڈرل شریعت کورٹ کسی قانون کو اسلامی احکامات سے متصادم قرار دے کر کالعدم کر سکتی ہے، لیکن ایسے فیصلوں کے خلاف سپریم کورٹ کے شریعت اپیلٹ بینچ میں اپیل کی جاسکتی ہے اور بالآخر اپیل سپریم کورٹ کے فُل بینچ کے پاس آسکتی ہے۔

عدالتیں عام طور پر مذہبی اقلیتوں کے حقوق کے تحفظ میں ناکام رہیں۔ عدالتوں نے شیعہ، مسیحیوں، احمدیوں اور دیگر مذہبی اقلیتی گروہوں کے خلاف توہین مذہب کے قوانین کا اطلاق امتیازی طور پر کیا۔ ماتحت عدالتوں نے توہین مذہب مقدمات میں مناسب شواہد کی ضرورت محسوس نہیں کی اور بعض ملزمان کئی برس جیل میں سزا بھگتنے کے بعد بالآخر اعلیٰ عدالتوں کی جانب سے سزا کالعدم قرار دیئے جانے کے بعد عدالتی حکم پر رہا ہو سکے۔

ایک تاریخی مقدمہ میں ۳۱ اکتوبر کو سپریم کورٹ نے ایک مسیحی خاتون آسیہ بی بی کو ۲۰۱۰ء میں توہین مذہب کیس میں سنائی گئی سزائے موت کو کالعدم قرار دے کر بری کر دیا۔ توہین رسالت کے خلاف سرگرم گروہوں کی جانب سے بڑے پیمانے پر احتجاج کے خدشے کے پیش نظر حکومت نے اس کیس میں اضافی نظر ثانی کی اپیل کی درخواست کی مخالفت نہ کرنے پر آمادگی ظاہر کی، جس سے کیس حتمی حل کے لیئے مزید ملتوی ہو گیا۔ آسیہ بی بی جیل سے رہا کر دی گئی لیکن تین دسمبر تک عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اُس کی اپنی سلامتی کے پیش نظر وہ ابھی تک حکومت کی زیر حفاظت ہے اور عدالتی نظر ثانی زیر التواء ہے۔

بعض کیسوں میں پولیس نے ایسے افراد کو گرفتار کیا جنہوں نے توہین مذہب یا مذہبی امتیاز روا رکھتے ہوئے اپنے طور پر کارروائی کی۔ فروری کے مہینہ میں انسداد دہشت گردی کی ایک عدالت نے اکتیس افراد کو سزا سنائی جنہوں نے ۲۰۱۷ء میں ہجوم کے ہاتھوں توہین مذہب کے الزام میں یونیورسٹی طالبعلم مشال خان کے قتل میں حصہ لیا تھا۔ انسداد دہشت گردی کی عدالت نے گولی چلانے والے مرکزی ملزم کو سزائے موت، پانچ دیگر ملزمان کو عمر قید اور پچیس افراد کو چار چار سال قید کی سزا سنائی۔ تاہم پشاور ہائی کورٹ نے پچیس افراد کی سزائیں معطل کرتے ہوئے اُنہیں ضمانت پر رہا کرنے کا حکم دے دیا۔

سیاسی قیدی اور اسیر ان

بعض سندھی اور بلوچ قوم پرست گروہ نے یہ دعویٰ کیا کہ حکام نے سیاسی وابستگی اور عقائد کی بنیاد پر ان کے ارکان کو گرفتار کیا۔ ۲۰۰۹ء کے آغاز حقوق بلوچستان اصلاحاتی پیکیج کے تحت (جس کا مقصد صوبے کے سیاسی، سماجی اور معاشی مسائل کو حل کرنا تھا) حکومت نے ان تمام بلوچ سیاسی قیدیوں، رہنماؤں اور کارکنوں کیلئے، جو جلاوطنی کی زندگی گزار رہے تھے یا مبینہ طور پر ملک دشمن سرگرمیوں میں ملوث تھے، عام معافی کا اعلان کیا تھا۔ ۲۰۱۵ء میں وفاقی اور بلوچستان کی صوبائی حکومتوں نے مشترکہ طور پر "پُرامن بلوچستان" پیکیج کا اعلان کیا جس کا مقصد ان "جنگجوؤں" کیلئے، جو دوبارہ معاشرتی دھارے میں شامل ہونے کے خواہشمند تھے، نقد رقوم اور دیگر ترغیبات کی پیشکش کی جانا تھی۔ ۱۵ اگست کو ہونے والے قومی اسمبلی کے اجلاس میں بلوچستان نیشنل پارٹی۔ مینگل کے رہنما اختر مینگل نے لوگوں کو غائب کئے جانے کا مسئلہ اٹھایا اور دعویٰ کیا کہ صوبے میں پانچ ہزار شہری لاپتہ ہیں۔

ضابطہ دیوانی اور تدارک

شہری انسانی حقوق کی مختلف اقسام کی خلاف ورزیوں کے ازالے کیلئے عدالت سے رجوع کر سکتے ہیں اور عدالتیں اکثر ایسے معاملات پر کارروائی کرتی ہیں۔ لوگ حکومتی اہلکاروں کی جانب سے انسانی حقوق کی خلاف ورزی کی دادرسی کیلئے دیوانی عدالتوں کی مدد لے سکتے ہیں۔ مبصرین کے مطابق دیوانی عدالتوں نے شاذونادر ہی ایسے مقدمات پر سرکاری فیصلے کئے اور زیادہ تر مقدمات عدالت سے باہر ہی حل کر لئے گئے۔ اگرچہ انتظامی سطح پر شکایات کے ازالے کا کوئی طریقہ کار موجود نہیں تھا لیکن اس حوالے سے غیر رسمی طریقے عام تھے۔ افراد اور تنظیمیں مخالفانہ فیصلوں کے خلاف انسانی حقوق کی تنظیموں کے ہاں اپیل نہیں کر سکے اگرچہ چند غیر سرکاری تنظیموں نے اقوام متحدہ اور دیگر بین الاقوامی اداروں کو انسانی حقوق کے حوالے سے اپنی "متبادل رپورٹیں" ضرور پیش کیں۔

و) چادر اور چہار دیواری یا خط و کتابت میں من مانی یا غیر قانونی مداخلت

ملکیت کی تلاشی کیلئے قانون کے تحت عدالت کا جاری کردہ وارنٹ کا ہونا ضروری ہے۔ پولیس نے اکثر اوقات اس شرط کو نظر انداز کیا اور بعض مواقع پر تلاشی کے دوران اشیاء چرالیں۔ حکام کی جانب سے غیر قانونی داخلے پر پولیس کو شاذونادر ہی سزا دی گئی۔ بعض دفعہ کسی مشکوک شخص کو گرفتاری پر مجبور کرنے کیلئے پولیس نے اس کے خاندان کے افراد کو پکڑ لیا۔ انسداد دہشتگردی قانون کے دائرے میں آنے والے کیسوں کے سلسلے میں قانون نافذ کرنے والے اداروں کو اضافی اختیارات حاصل ہو گئے جن میں کسی عدالتی اجازت نامے کے بغیر تلاشی اور ضبطگی بھی شامل ہے۔

کئی داخلی خفیہ ادارے سیاستدانوں، سیاسی کارکنوں، مشتبہ دہشتگردوں، این جی اوز، غیر ملکی اداروں کے ملازمین اور شعبہ صحافت سے وابستہ لوگوں پر نظر رکھتے رہے۔ ان خفیہ اداروں میں انٹر سروسز انٹیلی جنس، پولیس اسپیشل برانچ، انٹیلی جنس بیورو اور ملٹری انٹیلی جنس شامل تھے۔ باوثوق اطلاعات کے مطابق حکام نے عدالت کی اجازت کے بغیر باقاعدہ طور پر وائر ٹیپ استعمال کئے، سیل فون مانیٹر کئے، برقی خط و کتابت پکڑی اور ڈاک کو کھولا۔

ز) اندرونی تنازعات میں بدسلوکیاں

فوجی اور نیم فوجی اداروں نے جنگجوؤں کے محفوظ ٹھکانوں کو ختم کرنے کی غرض سے انسداد شورش پسندی اور انسداد دہشتگردی کے حوالے سے متعدد کارروائیاں کیں۔ فوج کی جانب سے فروری ۲۰۱۷ء میں شروع کیا جانے والا آپریشن ردالفساد سال بھر جاری رہا۔ ردالفساد ملک گیر سطح پر جاری انسداد دہشتگردی مہم ہے جس کا مقصد ۲۰۱۴ء تا ۲۰۱۷ء تک وفاق کے زیر انتظام سابق قبائلی علاقہ جات میں غیر ملکی اور مقامی دہشتگردوں کے خلاف کئے جانے والے آپریشن ضرب عضب کی کامیابیوں کو مستحکم کرنا ہے۔ قانون نافذ کرنے والے اداروں نے دہشتگرد گروہوں کو کمزور کرنے کی غرض سے

ان مشکوک دہشتگردوں اور جتھوں کے ارکان کو گرفتار کیا جنہوں نے مبینہ طور پر جنگجوؤں کو نقل و حمل کے سلسلے میں مدد فراہم کی۔ پولیس نے پورے ملک میں چھاپوں کے دوران ہتھیاروں کے ذخیرے، خودکش جیکٹیں اور منصوبہ بندی میں استعمال کیا جانے والے مواد پکڑا۔ پولیس نے اپنا دائرہ کار قبل ازیں حکومتی عملداری سے باہر علاقوں، بالخصوص بلوچستان میں موجود، علاقوں تک پھیلا دیا۔

ناقص سیکورٹی انتظامات، سیکورٹی فورسز اور عسکریت پسندوں کے خوف اور بلوچستان اور سابقہ قبائلی علاقوں میں رسائی پر حکومت اور سیکورٹی فورسز کے کنٹرول کے باعث، فوجی بدسلوکیوں کے شکار افراد کو ریلیف پہنچانے میں انسانی تنظیموں اور ایسے واقعات کو رپورٹ کرنے میں صحافیوں کو مشکلات پیش آئیں۔

۲۴ اگست کو سیکورٹی اداروں نے ہمزونی ضلع شمالی وزیرستان میں فوج کی جانب سے تلاشی کے خلاف احتجاج کرنے والے شہریوں پر گولی چلادی جس کے نتیجے میں دو افراد جاں بحق اور گیارہ زخمی ہوگئے۔ یہ واقعہ ایک روز قبل علاقے میں فوجیوں پر دیسی ساختہ دھماکہ خیز مواد سے ہونے والے ایک حملے کے بعد کرفیو کے نفاذ کے باعث پیش آیا۔ اگرچہ فائرنگ کا یہ واقعہ نسبتاً دور دراز علاقے میں پیش آیا لیکن انسانی حقوق کیلئے کام کرنے والے پشتون کارکنوں نے سوشل میڈیا کے ذریعے اس احتجاج کی خبر پھیلادی جو فوجی ترجمان اور حال ہی میں شمالی وزیرستان سے منتخب ہونے والے ایک ممبر قومی اسمبلی (جو نوزائیدہ پشتون انسانی حقوق تحریک کے رہنما بھی ہیں) کے درمیان ٹویٹر پر سخت الفاظ کے تبادلے پر منتج ہوئی۔

دہشتگردی کی کارروائیاں جاری رہیں اور ملک کے چاروں صوبوں، سابقہ قبائلی علاقہ جات اور گلگت۔ بلتستان میں خودکش حملے اور بم دھماکے ہوئے۔ جنگجوؤں اور دہشتگردوں، بشمول تحریک طالبان پاکستان، لشکر جھنگوی اور اسلامی اسٹیٹ صوبہ خراسان نے شہریوں، صحافیوں، مقامی رہنماؤں، فوجیوں، قانون نافذ کرنے والے اداروں کے اہلکاروں اور اسکولوں کو نشانہ بنایا اور بم دھماکوں، خودکش حملوں اور تشدد کے دیگر طریقوں کو استعمال کرتے ہوئے سینکڑوں لوگوں کو ہلاک و زخمی کیا۔ جنگجو اور دہشتگرد گروپوں نے اکثر مذہبی اقلیتوں پر حملے کئے۔ بلوچستان میں ایک کم شدت کی علیحدگی پسند شورش جاری رہی۔ اطلاعات کے مطابق سیکورٹی فورسز جنگجو گروہوں کے ساتھ لڑائی میں ماورائے عدالت ہلاکتوں کی مرتکب ہوئیں۔

جنگجوؤں نے ۲۵ جولائی کے انتخابات سے قبل سیاسی جماعتوں کے دفاتر، امیدواروں اور انتخابی ریلیوں پر حملے کئے۔ ۱۰ جولائی کو ایک خودکش بمبار نے پشاور میں عوامی نیشنل پارٹی کے سیاستدان ہارون بلور اور ۲۱ دوسرے لوگوں کو ہلاک کر دیا۔ ۱۳ جولائی کو بلوچستان کے علاقے مستونگ میں ایک انتخابی ریلی پر ہونے والے خودکش حملے میں ۱۳۰ لوگ مارے گئے۔ ۲۲ جولائی کو خیبر پختونخوا کے ضلع ڈیرہ اسمٰعیل خان میں پاکستان تحریک انصاف کے امیدوار برائے صوبائی اسمبلی اکرام اللہ گنڈاپور کی گاڑی پر خودکش حملہ ہوا جس میں وہ جاں بحق ہوگئے۔ ایک تیسرے خودکش حملے میں، جو الیکشن کے دن کوئٹہ میں ایک پولنگ اسٹیشن پر ہوا، ۳۱ افراد مارے گئے۔

کراچی میں اگرچہ فوجی آپریشن سے پہلے ہونے والی مار دھاڑ اور گینگ وار میں کمی دیکھنے میں آئی لیکن اس کے باوجود شہر میں سیاسی، فرقہ وارانہ، مجرمانہ اور نسلی بنیادوں پر تشدد جاری رہا۔ ۱۳ مارچ کو خودکار ہتھیاروں اور ہینڈ گرنیڈوں سے لیس افراد کے ایک گروہ نے کراچی کے علاقے لیاری میں گشت پر مامور سندھ رینجرز پر حملہ کیا، جس میں رینجرز کا ایک اہلکار زخمی ہوا جبکہ فائرنگ کے تبادلے میں حملہ آور گروہ کے چار ارکان مارے گئے۔

ہلاکتیں: ایسی اطلاعات ملیں جن کے مطابق سیکورٹی فورسز نے پورے ملک میں مشتبہ جنگجوؤں کے خلاف کارروائیوں کے دوران شہریوں کو جان سے مارا اور ماورائے عدالت ہلاکتوں کا ارتکاب کیا۔ ذرائع ابلاغ میں شائع ہونے والی متعدد رپورٹوں کے مطابق پولیس اور سیکورٹی فورسز نے مشتبہ

دہشتگردوں کو "پولیس مقابلوں" میں مارا۔ اس نوعیت کے ایک مشہور واقعے میں کراچی پولیس نے ۱۳ جنوری کو ایک پشتون نوجوان نقیب اللہ محسود کو ہلاک کر دیا، اس کے بارے میں قومی کمیشن برائے انسانی حقوق اور سندھ پولیس کی تحقیقات میں پتہ چلا کہ وہ ایک ماورائے عدالت قتل تھا جس کا ارتکاب پہلے سے طے شدہ انسداد دہشتگردی آپریشن کے تحت کیا گیا۔ جس اعلیٰ پولیس افسر پر اس کارروائی کا حکم دینے کا الزام عائد ہوا اسے معطل اور گرفتار کیا گیا، لیکن بعد ازاں ضمانت پر رہا کر دیا گیا۔ ۲۸ نومبر تک اس کے خلاف مقدمے کی سماعت جاری تھی۔

فرقہ وارانہ تشدد میں اگرچہ نمایاں کمی آئی لیکن بعض جگہوں پر حملے جاری رہے، جن میں ہنگو، خیبر پختونخوا، کی ایک شیعہ مسجد میں ہونے والا حملہ بھی شامل تھا، جس میں ۳۳ افراد مارے گئے، وہ اس سال کا پہلا بڑا فرقہ وارانہ حملہ تھا۔ مذہبی اقلیتوں کے افراد کو چن چن کر مارنے کا سلسلہ جاری رہا۔ شیعہ مسلک کے لوگوں کو چن چن کر مارنے کی اطلاعات ملتی رہیں، جن میں خیبر پختونخوا کے ضلع ڈیرہ اسمٰعیل خان میں واقع ایک شیعہ جماعت خانہ کے متولی کی ہلاکت بھی شامل تھی، تاریخی طور پر یہ شیعہ برادری کا علاقہ ہے جہاں حال ہی میں فوجی آپریشنوں کے دوران بے گھر ہونے والے سنی فرقے کے گھرانے آکر بس گئے ہیں۔ سپریم کورٹ نے پولیس کو علاقے میں فرقہ وارانہ بنیادوں پر ہونے والی قتل وغارت کو ختم کرنے کے لیئے اضافی اقدامات کرنے کا حکم دیا۔ اپریل میں بلوچستان کے شہر کوئٹہ میں گاڑی پر سوار افراد کے ہاتھوں ہونے والے چار حملوں میں شیعہ ہزارہ کمیونٹی کے چھ لوگ جاں بحق ہو گئے۔ پے در پے ہونے والی ان ہلاکتوں کی وجہ سے کوئٹہ میں ہزارہ نسل کی کمیونٹی نے مسلسل احتجاج شروع کر دیا۔ ۲۹ مئی کو بین المذاہب رواداری کیلیئے کام کرنے والے کارکن اور سکھ کمیونٹی کے رہنما چرن جیت سنگھ کو پشاور میں تاک کر گولی سے ہلاک کر دیا گیا۔ ۲۵ جون کو نامعلوم مسلح افراد نے احمدی فرقے سے تعلق رکھنے والے ایک شخص کو اس کے گھر میں قتل کر دیا، جس کی بظاہر وجہ اس کا عقیدہ تھا۔

جسمانی بدسلوکی، سزا اور تشدد: غیر ریاستی جنگجو گروپوں نے پرامن لوگوں کو ہدف بنایا اور ملک بھر میں مختلف واقعات میں شہریوں کو مارا۔

کمسن فوجی: غیر ریاستی جنگجو گروپوں نے بارہ سال کی عمر کے لڑکوں کو بھی جاسوسی، لڑائی یا خودکش بمباروں کے طور پر مرنے کیلیئے بھرتی کیا۔ جنگجوؤں نے اکثر ان لڑکوں کے والدین کو رقم دی، ان بچوں کو جنسی اور جسمانی تشدد اور بدسلوکی کا نشانہ بنایا اور انہیں ایسے کام کرنے کا جواز مہیا کرنے کیلیئے نفسیاتی جبر کے ہتھکنڈے استعمال کئے۔ حکومت نے بعد ازاں ان کمسن فوجیوں کی بحالی، تعلیم اور انھیں دوبارہ معاشرے کا حصہ بنانے کیلیئے سوات (خیبر پختونخوا) میں ایک سینٹر قائم کیا۔

جنگ وجدل سے متعلق دیگر بدسلوکیاں: ٹی ٹی پی، لشکر جھنگوی اور دوسرے دہشتگرد گروپوں نے سرکاری عمارتوں پر بم دھماکے اور استانیوں اور پولیو ویکسین مہم کے کارکنوں پر حملے کئے اور انھیں قتل کیا۔ ۱۸ جنوری کو نامعلوم حملہ آوروں نے ایک خاتون ہیلتھ ورکر اور اس کی بیٹی کو اس وقت مار ڈالا جب وہ کوئٹہ کے مضافات میں مریضوں کو پولیو ویکسین دے رہی تھیں۔ کوئٹہ ہی کے مضافاتی علاقے یارو میں ۱۱ اپریل کو رونما ہونے والے ایک اور واقعے میں ایک شخص نے پولیو ویکسین کے قطرے پلانے والے کارکنوں پر فائرنگ کر دی جس سے فرنٹیئر کور کا ایک اہلکار زخمی ہو گیا۔ ۲۳ اپریل کو دو حملہ آوروں نے ایک خاتون ہیلتھ ورکر پر چاقو سے حملہ کر دیا جس میں وہ مرتے مرتے بچی۔ ٹی ٹی پی نے خاص طور پر لڑکیوں کی تعلیم کیلیئے اپنی مخالفت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان کے اسکولوں کو نشانہ بنایا اور لڑکوں کے اسکول بھی تباہ کئے، فوجی آپریشنز اس وقت مقامی شہری آبادی کیلیئے مشکلات کا باعث

بن گئے جب جنگجوؤں نے علاقے تک رسائی فراہم کرنے والی اہم سڑکیں اور سرنگیں بند کر دیں اور مواصلات اور توانائی کی تنصیبات پر حملے کئے جس سے تجارت اور خوراک و پانی کا نظام درہم برہم ہو گیا۔

سیکشن دوئم: شہری آبادیوں کا احترام، بشمول:

الف: اظہار رائے کی آزادی، بشمول اخبارات:

قانون اخبارات سمیت اظہار رائے کی آزادی کی اجازت دیتا ہے، لیکن اس پر آئینی قدغنیں موجود رہیں۔ علاوہ ازیں دھمکیوں، ہراساں کئے جانے، تشدد اور قتل کے خوف نے صحافیوں اور مدیروں کو از خود سینسر شپ کے عمل پر مجبور کر دیا۔

اظہار کی آزادی: آئین "قانون کی جانب سے اسلام کی شان کے تحفظ کی خاطر معقول قدغن" یا "پاکستان کی سالمیت، سیکورٹی یا دفاع، بیرونی ملکوں کے ساتھ دوستانہ تعلقات، امن عامہ، شائستگی یا اخلاقیات کی پاسداری کو ملحوظ خاطر رکھنے" کی شرط پر تحریر و تقریر کی آزادی دیتا ہے۔ قانون شہریوں کو کھلے عام یا نجی محافل میں حکومت پر تنقید کی اجازت دیتا ہے لیکن عدالتی فیصلوں نے آئین کی اس انداز میں تشریح کی جس سے فوج اور عدلیہ پر تنقید ممنوع قرار پائی۔ اس طرح کی تنقید کا نتیجہ قانونی، سیاسی یا کاروباری سزا کی شکل میں بر آمد ہو سکتا تھا۔ توہین مذہب کے قوانین نے فرد کے مذہب اور مذہبی نظریے سے متعلق معاملات کے حوالے سے اظہار رائے کی آزادی کو محدود کر دیا۔ تعزیرات کی رُو سے "پیغمبر اسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین" سمیت متعدد الزامات کی سزا عمر قید سے لے کر موت تک ہے، عدالتوں کی جانب سے توہین سے متعلق قوانین کا نفاذ کیا گیا، اگرچہ اب تک کسی شخص کو توہین مذہب کا مرتکب ہونے کی بنا پر پھانسی نہیں دی گئی لیکن توہین مذہب کے الزامات نے اکثر لوگوں کی جانب سے ہجوم کو سر عام ملزم کو مارنے اور ایسے لوگوں پر کڑی نظر رکھنے پر اکسایا۔ حکومت نے نفرت آمیز تقریر اور دہشتگردی کے حوالے سے بعض اشارے کنایئے اور زبان استعمال کرنے پر پابندی عائد کی۔

اخبارات اور میڈیا کی آزادی: آزاد میڈیا متحرک رہا اور اس نے مختلف النوع نظریات پر اظہار خیال کیا۔ صحافیوں نے اکثر اوقات حکومت کو تنقید کا نشانہ بنایا، لیکن ایسے صحافیوں کو، جنہوں نے اس سال کے دوران حساس معاملات، بشمول سول۔ ملٹری تناؤ اور سیکورٹی فورسز کی جانب سے روا رکھی گئی بدسلوکیوں کو رپورٹ کیا، دھمکیوں، ہراساں کئے جانے اور تشدد کا سامنا کرنا پڑا۔ قانون کے تحت حکومت ایسی معلومات پر، جو قومی مفاد کے رُو سے تعصب پر مبنی ہوں، پابندی عائد کر سکتی ہے۔ حکام نے بعض اوقات ان قوانین کو میڈیا کو عدلیہ اور مسلح افواج پر تنقید کرنے سے روکنے یا ایسا کرنے کی پاداش میں سزا دینے کیلئے استعمال کیا۔ اخبارات نے جولائی میں منعقد ہونے والے عام انتخابات سے قبل سینسر شپ میں اضافے اور دباؤ کی وجہ سے اپنی رپورٹنگ کو از خود سینسر کرنا شروع کر دیا۔ یہ دباؤ انتخابات کے بعد بھی جاری رہا۔

ملک میں انگریزی، اردو اور علاقائی زبانوں میں ۴۰۰ سے زیادہ روزنامے اور ہفتہ وار رسالے شائع ہوتے ہیں۔ آزاد کشمیر میں اخبار شائع کرنے کیلئے مالکان کو کشمیر کونسل اور وزارت امور کشمیر سے اجازت حاصل کرنا پڑتی ہے۔ وزارت اطلاعات و نشریات نے ملک کی سب سے بڑی نیوز ایجنسی، ایسوسی ایٹڈ پریس آف پاکستان کا، جو مقامی ذرائع ابلاغ کیلئے حکومتی اور بین الاقوامی خبروں کے حصول کا منبع ہے، نظم و نسق سنبھال رکھا ہے۔ فوج کے پاس میڈیا اور تعلقات عامہ کیلئے انٹر سروسز پبلک ریلیشنز کے نام سے اپنا دفتر موجود ہے۔ حکومت کی ملکیت میں چلنے والی پاکستان براڈکاسٹنگ کارپوریشن اور

پاکستان ٹیلیویژن کارپوریشن سارے ملک میں ٹیلیویژن کے پروگرام نشر کرتی اور ریڈیو اسٹیشن چلاتی ہیں۔ سابقہ فاٹا اور پاٹا کے علاقوں میں حکام نے فاٹا سیکریٹریٹ کی اجازت سے خود مختار ریڈیو اسٹیشن چلانے کی اجازت دے رکھی ہے۔ پاکستان الیکٹرانک میڈیا ریگولیٹری اتھارٹی (پیمرا) نے ۸۹ نجی مقامی اور ۲۲ غیر ملکی ٹیلیویژن چینلوں کو لائسنس جاری کئے۔ ۱۴۳ کمرشل ایف ایم ریڈیو اسٹیشن بھی موجود ہیں لیکن ان کے خبریں نشر کرنے پر پابندی ہے۔ کچھ چینل ٹاک شوز کی صورت میں خبروں پر بحث کر کے اس پابندی سے بچ نکلتے ہیں۔

بین الاقوامی ذرائع ابلاغ کی نشریات عام طور پر دستیاب رہیں۔ تاہم بھارتی میڈیا کا مواد نشر کرنے پر پابندیاں تھیں۔ ۲۰۱۶ء میں پیمرا نے بھارتی میڈیا کا مواد نشر کرنے پر مکمل پابندی عائد کر دی۔ لاہور ہائیکورٹ نے فروری ۲۰۱۷ء میں یہ پابندی ختم کر دی لیکن بھارتی ٹیلیویژن کے ڈراموں پر پابندی اس وقت تک برقرار رہی جب تک لاہور ہائیکورٹ نے جولائی ۲۰۱۷ء میں دوبارہ اس پالیسی کے خلاف فیصلہ نہ دے دیا۔ پیمرا نے عید کی چھٹیوں کے دوران مقامی فلمیں دیکھنے کی حوصلہ افزائی کرنے کی غرض سے بھارتی فلمیں دکھانے پر دوبارہ پابندی عائد کر دی، اور اکتوبر میں سپریم کورٹ نے لاہور ہائیکورٹ کے پہلے دیئے تمام فیصلوں کو کالعدم قرار دیتے ہوئے مکمل پابندی پھر سے لاگو کر دی۔ چیف جسٹس سپریم کورٹ نے اپنے فیصلے میں تاثر دیا کہ بھارت کی جانب سے پاکستان کی طرف بہنے والے دریاؤں پر ڈیم تعمیر کرنے کے رد عمل میں اس پابندی کا جواز بنتا ہے۔

اسی سال کے دوران پیمرا نے ٹیلیویژن چینلوں کیلئے ہدایات جاری کرتے ہوئے اپنے چیئرمین کو اس بات کا اختیار دے دیا کہ وہ کسی بھی ایسے چینل کو بند کرنے کے مجاز ہیں جو پیمرا کے ضابطہ اخلاق کی، جس کے تحت ایسے احتجاج کی تشہیر ممنوع تھی جو لوگوں کو تشدد پر اُبھارے، خلاف ورزی کا مرتکب پایا جائے۔ ۲۹ اگست کو سپریم کورٹ کے حکم پر پیمرا نے ایک نوٹس جاری کیا جس کے تحت کسی کیس پر عدالت کا فیصلہ آنے سے قبل تبصرہ کرنے پر پابندی عائد کر دی گئی۔

جنوری میں وزارت داخلہ نے ریڈیو فری یورپ کی پشتو سروس، ریڈیو مشعال، کا اسلام آباد میں واقع دفتر بند کر دیا۔ وزارت نے یہ فیصلہ ایک خفیہ رپورٹ کی بنیاد پر کیا جس میں دعویٰ کیا گیا تھا کہ ریڈیو مشعال کے پروگرام پاکستان کے مفادات کے خلاف اور دشمن خفیہ ایجنسی کے ایجنڈے کے مطابق تھے۔

تشدد اور ہراسگی: سیکورٹی فورسز، سیاسی جماعتوں، جنگجوؤں اور دوسرے گروہوں کی جانب سے ذرائع ابلاغ کے اداروں، صحافیوں اور ان کے اہلخانہ پر تشدد کیا گیا اور انھیں ہراساں کیا گیا۔ خاص طور پر خاتون صحافیوں کو سوشل میڈیا سمیت دیگر ذرائع سے جنسی تشدد کی دھمکیوں اور ہراساں کئے جانے کا سامنا کرنا پڑا۔ سیکورٹی فورسز کی جانب سے مبینہ طور پر صحافیوں کو اغوا کیا گیا۔ ان میڈیا ہاؤسز کو، جنہوں نے ایسے موضوعات کے حوالے سے خبریں رپورٹ کیں جو حکام کے نزدیک حساس تھے، اکثر انتقام کا نشانہ بنایا گیا۔ مزید برآں دور دراز اور لڑائی سے متاثرہ علاقوں میں فرائض سرانجام دینے والے صحافیوں کے پاس جدید آلات اور اپنے تحفظ کی روایتی مہارتوں کی کمی تھی، جس کی وجہ سے ان پر از خود سینسر کے نفاذ یا کسی خبر کو رپورٹ نہ کرنے کیلئے دباؤ بڑھ گیا۔

کمیٹی ٹو پروٹیکٹ جرنلسٹس (سی پی جے) کے مطابق ریاستی اور غیر ریاستی عناصر نے صحافیوں پر جسمانی حملے کئے، انھیں ہراساں، خوفزدہ اور اغوا کیا، اور ان پر دباؤ ڈالنے کیلئے دیگر حربے استعمال کئے۔ سی پی جے نے سال کے دوران کسی صحافی کو ہدف بنا کر مارنے کے کسی واقعے کی تصدیق نہیں کی، لیکن وہ

مشتبہ ہلاکتوں کے محرکات کی تحقیقات کرتی رہی۔ سی پی جے نے صحافیوں کو قتل کرنے والے افراد کے خلاف ناکافی قانونی کارروائی کی بناء پر ملک کو اپنے سالانہ "سزا سے بریت کے زمرے" میں شامل کر لیا۔

سال کے دوران بعض صحافی قتل کئے گئے لیکن یہ واضح نہیں تھا کہ صحافتی پیشہ ہی ان کی موت کا محرک بنا۔

۲۲ اگست کو دو آدمیوں نے مبینہ طور پر ان کی مجرمانہ سرگرمیوں کو افشاء کرنے کی پاداش میں پنجاب کے ضلع وہاڑی میں صحافی محمد عابد حسین پر حملہ کیا۔ عابد ۲۳ اگست کو زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے چل بسا۔

سولہ اکتوبر کو اردو روزنامہ کے ٹوٹائمز کے رپورٹر سہیل احمد کو ہری پور (خیبر پختونخوا) میں ڈرائیونگ کے دوران گولی مار قتل کر دیا گیا۔ پولیس نے دو مشتبہ افراد کو گرفتار کر لیا اور یہ ظاہر کیا کہ متوفی کی جانب سے ملزمان کے منشیات فروشی کے کاروبار کو افشاء کرنا اس کی ہلاکت کا سبب بنی۔

دیگر واقعات میں صحافیوں کو مارا پیٹا اور گرفتار کیا گیا اور ان کے کام میں رکاوٹ پیدا کی گئی۔ ۱۳ جولائی کو صوبہ پنجاب کی پولیس نے ناروے کے ایک ٹیلیویژن چینل کے رپورٹر قذافی زمان کو اس وقت گرفتار کر کے تشدد کا نشانہ بنایا جب وہ گجرات شہر میں پاکستان مسلم لیگ-ن (پی ایم ایل-این) کی سیاسی ریلی کی کوریج کر رہا تھا۔ حکام نے اسے ۳۸ دیگر افراد کے ہمراہ اقدام قتل اور امن عامہ میں نقص پیدا کرنے جیسے الزامات کے تحت گرفتار کر لیا اور کئی دن جیل میں رکھنے کے بعد ضمانت پر رہا کر دیا۔

۸ نومبر کو سادہ کپڑوں میں ملبوس سیکورٹی اہلکار زبردستی کراچی پریس کلب میں داخل ہو گئے اور عمارت کے اندرونی حصے کی تصویریں لیتے ہوئے وہاں جاری ایک تقریب کو درہم برہم کر دیا۔ اگلے روز سیکورٹی فورسز نے پریس کلب کے رکن نصر اللہ چوہدری کو ایک دہشتگرد کی معاونت کے الزام میں گرفتار کر لیا اور دعویٰ کیا کہ قبل ازیں پریس کلب پر مارا جانے والا چھاپہ بھی نصر اللہ چوہدری کی تلاش کیلئے جاری کوششوں کا حصہ تھا۔ صحافیوں نے وسیع پیمانے پر اس چھاپے کو خوفزدہ کرنے کی کوشش قرار دیتے ہوئے اس پر تنقید کی اور کہا کہ فوجی آمریتوں کے ادوار میں بھی پریس کلبوں کو سیکورٹی فورسز کیلئے ممنوعہ علاقہ سمجھا جاتا تھا۔

سینسر شپ یا مواد کی اشاعت پر پابندیاں: میڈیا تنظیموں نے عام طور پر ایسی خبروں کی نشر و اشاعت پر، خاص طور پر وہ جن کا تعلق فوج سے ہو، اپنے آپ پر از خود سینسر شپ نافذ کئے رکھی۔ صحافیوں کا کہنا تھا کہ انھیں سرکاری طور پر باقاعدگی سے لڑائی والے علاقوں کا دورہ کرنے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا جاتا تھا، یا ان کیلئے ضروری قرار دیا گیا کہ وہ ایسے علاقوں کی صورتحال کو رپورٹ کرنے کی غرض سے فوجی اہلکاروں کے ہمراہ وہاں جائیں۔ انھوں نے بتایا کہ ان پر ایسی خبریں دینے کیلئے دباؤ ڈالا گیا جو فوجی نکتہ نظر کی تائید کرتی ہوں۔ دیگر خبروں میں عمیق تجزیئے کے بجائے، جسے صحافی حضرات عام طور پر پُر خطر سمجھتے تھے، معروضی رپورٹنگ پر توجہ مرکوز کی گئی۔ مقامی اور غیر ملکی صحافیوں نے کی جانب سے، بالخصوص جولائی میں منعقد ہونے والے قومی انتخابات سے قبل، شکایات موصول ہوئیں کہ انھیں حکومتی اہلکاروں نے ہراساں اور خوفزدہ کیا۔ توہین مذہب اور احمدیوں کے خلاف قوانین کی وجہ سے بعض موضوعات کی اشاعت محدود ہو کر رہ گئی۔ حکومتی سینسرز نے غیر ملکی کتابوں کی دوبارہ اشاعت سے قبل ان پر نظر ثانی کی، لیکن ایسی کوئی رپورٹ موصول نہیں ہوئی جس کے مطابق سال کے دوران کسی کتاب پر پابندی عائد کی گئی ہو۔ درآمد شدہ فلموں، کتب، رسائل اور اخبارات کو قابل اعتراض جنسی اور مذہبی مواد کے شبے میں سینسر کیا گیا۔ فحش ادب، جو ایک ایسا موضوع ہے جو حکومت کی جانب سے وسیع تر معنوں میں مستعمل رہا، ضبط کر لیا گیا۔

حکومت نے مبینہ طور پر ضابطہ اخلاق کی خلاف ورزی کرنے اور ممنوعہ مواد دکھانے پر نجی ٹیلیویژن چینلوں پر جرمانہ عائد کیا۔ خبروں کے مطابق حکام نے پیمرا قوانین کو استعمال کرتے ہوئے لائسنس کی معطلی یا ایسا کرنے کی دھمکی دے کر نشریاتی ذرائع ابلاغ کو خاموش کروایا، جس کے نتیجے میں بہت سے اداروں کو، خاص طور پر مذہب اور دفاع سے متعلق معاملات کے حوالے سے، اپنے اوپر از خود سینسر شپ نافذ کرنا پڑی۔ سینٹرل بورڈ آف فلم سینسرز نے ایسی غیر ملکی اور مقامی فلموں کو سینسر کیا جن میں جنسی مواد پایا گیا اور بھارتی ہیروز، رہنماؤں اور فوجی شخصیات کا قد کاٹھ بڑھا چڑھا کر پیش کیا گیا تھا۔

جولائی میں منعقد ہونے والے قومی انتخابات سے قبل ذرائع ابلاغ کے ان اداروں کو جو پاکستان مسلم لیگ۔ن کے حامی تھے، ترسیل میں رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑا۔ انگریزی روزنامہ ڈان نے ۱۲ مئی کو سابق وزیر اعظم نواز شریف کا ایک متنازعہ انٹرویو شائع کیا۔ ڈان کے مطابق ۱۵ مئی سے صوبہ بلوچستان کے زیادہ تر حصوں، صوبہ سندھ کے بیشتر شہروں اور فوج کے زیر انتظام تمام علاقوں میں اس اخبار کی ترسیل و تقسیم پر پابندی عائد کر دی گئی۔ جنگ۔ جیو گروپ کی جانب سے بھی ہراساں کئے جانے اور اخبار کی ترسیل میں رکاوٹوں کا سامنا کرنے کی اطلاعات ملیں۔ نامعلوم افراد نے اخبارات کے تقسیم کنندگان پر دباؤ ڈالا کہ وہ اردو روزنامہ جنگ اور اس ادارے کے انگریزی اخبار دی نیوز کو تقسیم نہ کریں، اور جنگ۔ جیو گروپ کو اشتہارات دینے پر مشتہرین کی حوصلہ شکنی کی گئی۔ ملک کے بہت سے حصوں میں کیبل آپریٹروں نے جیو ٹی وی کو اپنے کیبل سسٹم سے نکال دیا، یا بار بار اس کیلئے مختص چینل نمبر کو تبدیل کیا۔

قومی سلامتی: بعض صحافیوں نے دعویٰ کیا کہ حکام نے ایسے مواد کو، جس میں حکومتی پالیسیوں یا فوجی اور سرکاری افسروں پر تنقید کی گئی تھی، سینسر کرنے یا اس کی تقسیم پر پابندی عائد کرنے کی غرض سے قومی سلامتی کو تحفظ دینے والے قوانین کا حوالہ دیا۔ الیکٹرانک میڈیا (پروگرامز و اشتہارات) کوڈ آف کنڈکٹ میں شامل ایک شق کے تحت کسی بھی ایسے علاقے میں، جہاں فوجی کارروائی ہو رہی تھی، رپورٹنگ پر پابندی عائد کی گئی۔

غیر سرکاری اثر: ۲۰۱۳ء سے غیر ریاستی عناصر کی جانب سے صحافتی کارکنوں پر تشدد میں کمی آئی لیکن جنگجو اور جرائم پیشہ عناصر کی جانب سے صحافیوں اور ان کے خاندانوں کو جان سے مارنے، انھیں اغوا کرنے، ان پر حملے کرنے اور انہیں خوفزدہ کرنے کی ایک پوری تاریخ ہے۔

انٹرنیٹ کی آزادی

پاکستان ٹیلی کمیونیکیشن اتھارٹی (پی ٹی اے) ٹیلی مواصلات کے قیام، چلانے اور اس کی دیکھ بھال کی ذمہ دار ہے اور ٹیلی مواصلات کے ذرائع پر مواد کی نشریات پر مکمل کنٹرول رکھتی ہے۔ پی ٹی اے کے مطابق اگست تک جمع کئے گئے اعداد و شمار کے مطابق ملک میں لگ بھگ پانچ کروڑ اسی لاکھ براڈ بینڈ انٹرنیٹ صارفین موجود تھے جو کہ انٹرنیٹ کے پھیلاؤ کا ستائیس اعشاریہ آٹھ فیصد ہے۔

۲۰۱۲ء سے حکومت نے اسلام مخالف، ریاست اور عسکری اداروں پر تنقید تصور کئے جانے والے اور فحش مواد کی روک تھام یا اسے بند کرنے کے لیئے قومی سطح پر مواد کی نگرانی اور چھان بین کا باضابطہ نظام قائم کر رکھا ہے۔ ذرائع ابلاغ برقی ذرائع پر جرائم کی روک تھام کا قانون مجریہ ۲۰۱۶ء حکومت کو انٹرنیٹ پر مواد ہٹانے کے وسیع اختیارات دیتا ہے جسے حکام نے سول سوسائٹی کے خلاف اپنے مسلسل اقدامات کیلئے استعمال کیا۔ حکومت نے کئی ویب سائٹس کو مبینہ طور پر غیر اسلامی، فحش، توہین آمیز اور انتہا پسند مواد کی تشہیر کے الزام میں بند کر دیا۔ وفاقی وزارت برائے مذہبی اُمور توہین مذہب کے زُمرے میں آنے والی ویب سائٹس کو بلاک کرنے کیلئے رابطہ کرتی ہے۔ اطلاعات کے مطابق حکومت نے بعض انتہا پسند اور بلوچ علیحدگی پسندوں کی حامی سائٹس کو بلاک یا کنٹرول کرنے کی کوشش کی۔ حکومت کی جانب سے نگرانی کا سافٹ ویئر استعمال کرنے کی بھی اطلاعات تھیں۔ مواد کی نگرانی

کے عمل میں شفافیت اور احتساب کا فقدان تھا اور حکومت نے متعدد بار کارروائی کے لئے قانونی طریقہ کار کو نظر انداز کرتے ہوئے غیر واضح پیمانہ استعمال کیا۔

۴ جون کو فوج کے شعبہ تعلقات عامہ کے سربراہ نے انکشاف کیا کہ سرکاری جاسوس ادارے چوکسی سے ملک کے اندر اور باہر سرگرم "ریاست مخالف" سوشل میڈیا اکاؤنٹس کی نگرانی کرتے رہے ہیں۔ پریزنٹیشن کے دوران ڈی جی آئی ایس پی آر نے ریاست کیلئے خطرہ تصور کئے جانے والے صحافیوں اور بلاگروں کے ذاتی کوائف اور ان کے ٹوئٹر اکاؤنٹ کی معلومات پر مبنی چارٹ بھی دکھایا۔ نومبر میں دو معروف صحافیوں گُل بخاری اور طٰہٰ صدیقی کو مبینہ طور پر " قابل اعتراض " مواد شائع کرنے پر ٹوئٹر کی جانب سے بیک وقت نوٹس موصول ہوئے۔ دونوں نے حکومت پر کھلم کھلا الزام لگایا کہ سرکاری سطح پر اس قسم نگرانی تنقیدی ٹوئیٹس پر پابندی عائد کرنے کی کوشش ہے۔ گزشتہ سال ان دونوں صحافیوں کو اغوا کرنے کی کوشش بھی کی گئی۔ ۱۸ اگست کو پی ٹی اے نے کھلے عام ٹوئٹر انتظامیہ کو دھمکی دی کہ حکومت کی جانب سے " قابل اعتراض " مواد نہ ہٹانے کی درخواست پر عمل نہ کرنے کی صورت میں کو ملک میں ٹوئٹر کے آپریشنز کو بند کر دیا جائے گا۔

تعلیم و تدریس کی آزادی اور تہذیبی تہوار

حکومت نے عام طور پر تعلیمی آزادی کو محدود نہیں کیا لیکن ثقافتی تہواروں کی نگرانی کی اور سینسر شپ عائد کی۔ فنون لطیفہ کی نمائشوں، موسیقی اور ثقافتی سرگرمیوں میں حکومت کی مداخلت جاری رہی۔ اس قسم کے تہوار منعقد کرنے کیلئے حکومت سے پیشگی اجازت، یعنی این او سی، لینا لازمی ہوتا ہے۔

آئین اور قانون پرامن اجتماع اور انجمن سازی کی آزادی دیتے ہیں لیکن یہ آزادیاں پابندیوں سے مشروط ہیں۔

ب) پُرامن اجتماع اور وابستگی کی آزادی

آئین اور قانون پُرامن اجتماع اور انجمن سازی کا حق فراہم کرتے ہیں تاہم ان آزادیوں پر بعض وجوہات پر پابندی لگ سکتی ہے۔

پرامن اجتماع کی آزادی

قانون کے تحت ضلعی انتظامیہ پولیس کی اجازت کے بغیر چار سے زائد افراد کے اجتماع کو روک سکتی ہے۔ قانون کی رُو سے حکومت کو سیکورٹی وجوہ کی بنا پر جنازے کے جلوس کے سوا تمام ریلیوں اور جلوسوں پابندی لگانے کی اجازت ہے۔

حکام نے بالعموم احمدیوں کو جو مذہبی اقلیت ہیں، کانفرنسوں اور اجتماعات کے انعقاد سے روکا۔ احمدیوں نے ۱۴ مئی کو سیالکوٹ کے حکام کی جانب سے احمدیہ مسجد کی بندش اور سیالکوٹ اور فیصل آباد میں دو دوسری مساجد میں لوگوں کے حملوں کو اپنی برادری کے لئے جاری سخت حالات کے ثبوت کے طور پر پیش کیا۔

سال کے دوران پشتون تحفظ موومنٹ یا پی ٹی ایم نے انصاف کے مطالبے اور حکومت کے سکیورٹی اداروں کی زیادتیوں سے تحفظ کے لئے دھرنوں اور مظاہروں کے لئے اپنے حامیون کو جمع کیا جن میں بیشتر پشتون تھے۔ ہزاروں افراد نے پورے ملک میں بڑی آبادی والے شہروں میں، جن میں کراچی، لاہور، پشاور اور اسلام آباد شامل ہیں، پرامن احتجاج میں شرکت کی۔ مبصرین کے مطابق حکام نے گرفتاریوں، ڈرو دھمکیوں اور خوف وہراس کے ذریعے مظاہرین کی حوصلہ شکنی کی کوشش کی تاہم وہ پی ٹی ایم کی حمایت کرنے والوں کے خلاف تشدد کے کسی باقاعدہ عمل کا حصہ نہیں بنے۔

پر امن اور پر تشدد دونوں طرح کے احتجاج، ہڑتالیں اور مظاہرے پورے ملک میں ہوئے۔ حکومت نے عمومی طور پر سیاسی اور کسی بھی وابستگی کے حامل سول سوسائٹی گروپوں کو اسلام آباد کے ریڈ زون میں، جو ایک حساس علاقہ ہے جہاں ڈپلومیٹک انکلیو اور وفاقی حکومت کی عمارتیں ہیں، مظاہروں کے انعقاد سے روکا، جس کی وجہ حفاظتی اقدامات بتائے گئے جن کے تحت اس علاقے میں تمام عوامی ریلیوں اور اجتماعات پر پابندی ہے۔

انجمن سازی کی آزادی

آئین انجمن سازی کی آزادی قانون کے تحت عائد بعض پابندیوں کے ساتھ فراہم کرتا ہے۔ حکومت نے پالیسیوں کے اس تسلسل کو برقرار رکھا، جن سے بین الاقوامی غیر سرکاری تنظیموں (آئی این جی اوز) کی کام کرنے کی آزادی اور آبادیوں تک رسائی میں بتدریج کمی آئی۔ آئی این جی اوز، اقوام متحدہ کے اداروں اور غیر ملکی سفارتخانوں کو اندرون ملک سفر، بعض منصوبہ جاتی سرگرمیوں یا نئے منصوبوں کے آغاز سے پہلے این او سی کی صورت میں حکومت کی اجازت طلب کرنی پڑتی ہے۔

حکومت نے ۲۰۱۵ میں بین الاقوامی غیر سرکاری تنظیموں کے لئے آن لائن رجسٹریشن کا نظام رائج کیا اور ستمبر میں بین الاقوامی غیر سرکاری تنظیموں کے لئے ایک اور سمجھوتہ متعارف کرایا جس سے ان کے کام کرنے کی صلاحیت مزید محدود ہو گئی، جس کی پاسداری لازمی ہے۔ رجسٹریشن کا عمل بے پناہ دستاویزی شرائط، کثیر المراحل جائزوں اور سکیورٹی اور دیگر حکومتی محکموں کی مستقل تحقیقات کا متقاضی ہے۔ حکومت نے ۲۰۱۷ء اور ۲۰۱۸ء میں درجنوں بین الاقوامی غیر ملکی تنظیموں کی رجسٹریشن کی درخواستوں کو مسترد کیا۔ اپیلوں کے ایک طویل عمل کے بعد اکتوبر میں وزارت داخلہ نے اٹھارہ بین الاقوامی غیر سرکاری تنظیموں کو مسترد کرنے کے حتمی نوٹس جاری کئے اور ان کے اندراج سے انکار کرتے ہوئے انہیں ساٹھ دنوں کے اندر اپنا کام بند کرنے کا حکم جاری کیا۔ مسترد کئے جانے کے نوٹسوں میں مسترد کئے جانے کی وجوہ نہیں بیان کی گئیں۔

رجسٹریشن سے متعلق برسوں کی غیر یقینی صورتحال کی وجہ سے ان بین الاقوامی غیر سرکاری تنظیموں پر منفی اثرات مرتب ہوئے، جنہیں مسترد کئے جانے کے حتمی نوٹس نہیں ملے ہیں۔ انہیں فنڈز کے حصول، بینک اکاؤنٹس کھولنے اور ایف بی آر سے ٹیکس سے استثنیٰ حاصل کرنے میں اضافی رکاوٹوں کا سامنا رہا۔ ایک منظور شدہ اندراج کے بغیر بعض صوبوں میں این او سی کا حصول مشکل بن گیا، جس کی وجہ سے منصوبوں پر عملدرآمد اور ان کی نگرانی میں رکاوٹ پیش آئی حتیٰ کہ ان بین الاقوامی غیر سرکاری تنظیموں کو بھی رکاوٹ کا سامنا رہا جنہوں نے رجسٹریشن کے نئے عمل کا آغاز کر دیا تھا۔ بین الاقوامی غیر سرکاری تنظیموں کے غیر ملکی عملے کے لئے ویزے مسترد کئے جانے میں اضافہ ہوا۔ حکومت نے ویزا درخواستوں اور علیحدہ سروے کے دوران کنٹری ڈائریکٹروں اور غیر ملکی عملے سے دریافت کیا کہ آیا وہ بھارتی یا اسرائیلی شہری تو نہیں ہیں۔ رجسٹریشن کے عمل میں عدم شفافیت اور غیر یقینی کی صورتحال کی وجہ سے بعض بین الاقوامی غیر سرکاری تنظیموں کو مجبوراً اپنے اندراج کی درخواست واپس لینا پڑی اور ملک میں اپنا کام بند کرنا پڑا۔ حکومت نے وفاقی اور صوبائی دونوں سطحوں پر غیر ملکی فنڈز سے چلنے والی غیر سرکاری تنظیموں (این جی اوز) کی رسائی بھی ایک علیحدہ رجسٹریشن نظام، اعتراض نہ ہونے کی سند کے حصول اور دیگر شرائط کے ذریعے محدود کی۔ حکام نے این جی اوز کے لئے یہ شرط عائد رکھی کہ وہ غیر ملکی رقوم کے حصول، کسی جگہ کی بکنگ، یا تقریبات کے انعقاد کے لئے یونیورسٹی کی جگہوں کے استعمال یا حساس انسانی حقوق پر کام کرنے سے قبل این او سی حاصل کریں۔ حتیٰ کہ جب غیر ملکی فنڈز حاصل کرنے والی مقامی این جی اوز کا مناسب طور پر اندراج کر لیا گیا، تب بھی حکومت نے اکثر ان کی این او سی کے حصول کی درخواستوں کو مسترد کر دیا۔ مزید براں تمام مطلوبہ دستاویزات کی حامل ملکی این جی اوز کی حکومتی نگرانی کی گئی اور خوف ہراساں کیا گیا۔

ج) مذہبی آزادی

محکمہ خارجہ کی بین الاقوامی مذہبی آزادی رپورٹ اس لنک پر دیکھئے۔

www.state.gov/religiousfreedomreport/

د) نقل و حرکت کی آزادی

قانون اندرون ملک نقل و حرکت اور بلا روک ٹوک غیر ملکی سفر، ترک وطن اور وطن واپسی کی اجازت دیتا ہے، لیکن حکومت نے ان حقوق کو محدود کیا۔

حکومت نے ملک کے اندر بے گھر ہونے والے افراد، پناہ گزینوں، واپس جانے والے مہاجرین، پناہ مانگنے والوں اور ایسے دیگر افراد کے، جن کی جان خطرے میں تھی، تحفظ اور معاونت کے لئے اقوام متحدہ کے ہائی کمشنر برائے پناہ گزین (یو این ایچ سی آر) کے دفتر اور دیگر انسانی بنیادوں پر کام کرنے والے دیگر اداروں سے تعاون کیا۔

تارکین وطن، پناہ گزین اور بے وطن افراد سے بدسلوکی: حکومت نے باقاعدہ طور پر اندراج کردہ اور رجسٹریشن کارڈز کے حامل ۱۴ لاکھ افغان باشندوں کو عارضی قانونی درجہ فراہم کیا۔ پاکستان مسلم لیگ (ن) اور بعد میں آنے والی عبوری حکومتوں نے ۳۰ ستمبر تک بار بار تھوڑی مدت کے لیئے رجسٹریشن کارڈ میں توسیع کی، جس سے رجسٹریشن کارڈز کے حامل افراد کے لئے غیر یقینی کی صورتحال کا ماحول پیدا ہو گیا۔ اکتوبر میں پی ٹی آئی کی حکومت نے ۳۰ جون ۲۰۱۹ء تک طویل المدت توسیع دیتے ہوئے قلیل مدتی توسیع کے رجحان کا خاتمہ کیا۔ وزیر اعظم عمران خان نے ملک میں پیدا ہونے والے افغان پناہ گزینوں اور بنگالیوں کو شہریت دینے کی پیشکش کا وعدہ ۱۶ ستمبر کو کیا۔ حکومت نے اس مسئلے کو جواب تک متنازع ہے، حل کرنے کے لئے ایک پارلیمانی کمیٹی قائم کی۔

یہ اطلاعات زیر گردش رہیں کہ صوبائی حکام، پولیس اور میزبان آبادیوں نے افغان پناہ گزینوں کو ہراساں کیا۔ یو این ایچ سی آر نے رپورٹ کیا کہ جنوری سے اکتوبر تک پناہ گزینوں کی گرفتاریوں اور حراست میں لیئے جانے کی تعداد ۸۲۸ تھی۔ جن تمام لوگوں کو گرفتار کیا گیا تھا انہیں اکثر یو این ایچ سی آر یا اس کے شراکت داروں کی مداخلت پر رہا کر دیا گیا، جن میں ۷۴ فیصد کو بغیر الزامات چھوڑا گیا ہے۔ ۲۵ جولائی کے عام انتخابات کے لئے حکومت کی جانب سے شروع کئے گئے حفاظتی اقدامات کی وجہ سے زیادہ تر گرفتاریوں میں تیزی آئی۔

اندرون ملک نقل و حرکت: سابق فاٹا اور بلوچستان کے بعض علاقوں تک رسائی پر حکومتی پابندیوں سے، جو حفاظتی خدشات کے پیش نظر تھیں، نقل و حرکت کی آزادی متاثر ہوئی۔ حکومت نے ملک کے ان علاقوں کے، جنہیں "حساس" قرار دیا گیا تھا، سفر کے لئے این او سی کی منظوری کی شرط عائد رکھی۔

غیر ملکی سفر: قانون کے تحت اسرائیل کے سفر کی ممانعت ہے اور ملک کے پاسپورٹ میں یہ درج ہوتا ہے کہ "یہ اسرائیل کے سوا تمام ملکوں کے لئے موثر ہے۔" پاسپورٹ کی درخواستوں میں درخواست گزاروں کے لئے اپنی مذہبی وابستگی کا اندراج لازمی تھا اور مسلمان ہونے کی صورت میں اس بیان کی تصدیق ضروری تھی کہ احمدیہ تحریک کا بانی ایک جھوٹا نبی ہے۔ احمدی نمائندوں نے رپورٹ کیا کہ حکام نے اس بیان کو مسترد کرنے پر ان کے پاسپورٹ پر لفظ "احمدی" تحریر کیا۔

پالیسی کے مطابق حکومتی ملازمین اور طالب علموں کے لئے بیرون ملک سفر کے لئے حکومت سے این او سی لازمی حاصل کرنا ہوتی ہے، تاہم حکام اس شرط پر شاذ و نادر عمل کرتے ہیں۔

حکومت نے ایگزٹ کنٹرول لسٹ میں شامل افراد کو ملک سے روانہ ہونے سے روکا۔ اس فہرست کا بیان کردہ مقصد "ریاست کے خلاف سرگرمیوں، دہشت گردی یا کالعدم تنظیموں سے متعلق سرگرمیوں میں ملوث افراد اور اعلیٰ عدالتوں کے احکامات پر اس فہرست میں شامل کئے گئے افراد" کو ملک چھوڑنے سے روکنا ہے۔ اس فہرست میں شامل افراد کو اپنے نام فہرست سے ختم کرانے کے لئے عدالتوں میں اپیل کرنے کا حق حاصل تھا۔

جلاوطنی: حکومت نے دیگر ملکوں سے ملک بدر کئے گئے بعض پاکستانیوں کو واپس نہیں آنے دیا۔ حکومت نے بیرون ملک پاکستانی سفارتخانوں کی جانب سے پاسپورٹ کے اجراء کے باوجود ان ملک بدر کئے گئے افراد کو غیر شناخت شدہ پاکستانی شہری کہتے ہوئے لینے سے انکار کر دیا۔

اندرون ملک دربدر ہونے والے افراد

خیبر پختونخوا اور سابق فاٹا میں فوجی سرگرمی اور فوجی کارروائی کے نتیجے میں ۲۰۰۸ء سے بڑے پیمانے پر آبادیاں بے گھر ہوئیں۔ ان بے گھر افراد کی واپسی سیکیورٹی کے بہتر حالات میں جاری ہے۔ اقوام متحدہ کے دفتر برائے رابطہ انسانی امور کے مطابق مجموعی طور پر ۵۳ لاکھ متاثرہ مکینوں میں سے ۲۹ ہزار مئی تک بے گھر تھے۔ حکومت اور یو این ایچ سی آر، یونیسیف اور عالمی ادارہ خوراک جیسے اقوام متحدہ کے اداروں نے تنازع سے متاثر ہونے والے افراد کی، جو عمومی طور پر میزبان خاندانوں، کرائے کے مکانوں یا نسبتاً کم تعداد میں کیمپوں میں مقیم تھے، معاونت و تحفظ کے لئے اشتراک کیا۔ بے گھر ہونے والی کئی آبادیوں کو لاہور اور کراچی جیسے بڑے شہروں کے باہر غیر رسمی رہائشی آبادیوں میں ٹھہرایا گیا۔

حکومت نے فوجی کارروائیوں کی وجہ سے بے گھر ہونے والے شہریوں کی معاونت کرنے والے انسانی ہمدردی کی بنیادوں پر کام کرنے والے اداروں پر سابق فاٹا کے تمام اضلاع تک رسائی کے لئے عدم اعتراض کی سند (این او سی) کے حصول کی درخواست کی شرط عائد رکھی۔ ان اداروں اور غیر سرکاری تنظیموں (این جی اوز) کے مطابق سرٹیفکیٹ کے حصول کا طریقہ بہت پیچیدہ تھا اور منصوبوں کو بہت زیادہ تاخیر کا سامنا کرنا پڑا۔ حکومت نے انسانی بنیادوں پر کام کرنے والے اداروں کی جانب سے رسائی اور سیکیورٹی سے متعلق خدشات کے اظہار کے باوجود سابق فاٹا کے ان اضلاع میں، جہاں فوجی کارروائیاں کی گئی تھیں، اور ان کے قریب آئی ڈی پی کیمپ قائم کئے۔ کیمپوں میں معاونت کے لئے انسانی بنیادوں پر کام کرنے والے اداروں کے ان کیمپوں میں کارکنوں کو سابق فاٹا کی جانب اس کے اندر سفر میں خطرے کا سامنا رہا۔ اقوام متحدہ کے اداروں نے کیمپوں اور متاثرہ علاقوں تک رسائی مقامی این جی اوز کے ذریعے قائم رکھی۔

غیر رضاکارانہ واپسی کی اطلاعات موصول نہیں ہوئیں۔ اطلاعات کے مطابق دربدر ہونے والے کئی افراد بنیادی ڈھانچے، رہائش کی کمی، خدمات کی عدم دستیاب اور واپس جانے والوں کی نقل و حرکت پر چیک پوسٹوں کے ذریعے سیکورٹی فورسز کے سخت کنٹرول کے باوجود گھروں کو واپس جانا چاہتے تھے۔ بے گھر ہونے والے دیگر خاندانوں نے یا تو واپسی کو ملتوی کیا یا انہوں نے خیبر پختونخوا کے ان علاقوں میں، جہاں صحت، تعلیم اور دیگر سماجی خدمات دستیاب تھیں، رہنے کے لئے اپنے بعض اہل خانہ کا انتخاب کیا۔ مقامی طور پر بے گھر ہونے والے ایسے افراد کے لئے جو واپسی پر آمادہ نہیں تھے یا واپس جانے کے قابل نہیں تھے، حکومت نے اقوام متحدہ اور دیگر بین الاقوامی اداروں کے ساتھ رابطہ قائم رکھا۔ عالمی ادارہ خوراک نے تنازع کی وجہ سے خیبر پختونخوا میں بے گھر ہونے والے میں غذائی راشن تقسیم کیا اور ان آئی ڈی پیز کو چھ ماہ کے غذائی آپریشن کی فراہمی جاری رکھی، جو سابق فاٹا میں اپنے اپنے علاقوں میں واپس چلے گئے تھے۔

قدرتی آفات اور دہشت گرد سرگرمیوں اور دہشت گردوں کے خاتمے کی کارروائیوں کے نتیجے میں افراد کے بڑے پیمانے پر بے گھر ہونے کے باوجود حکومت نے اندرون ملک بے گھر ہونے والی آبادیوں کے مسائل کے حل کے لئے کوئی خاص قانون سازی نہیں کی۔ اس کے علاوہ نیشنل ڈیزاسٹر مینجمنٹ ایکٹ ۲۰۱۰ء آئی ڈی پیز یا ان کے حقوق کی کوئی مخصوص تعریف بیان نہیں کرتا۔

پناہ گزینوں کا تحفظ

پناہ تک رسائی: قانون پناہ یا پناہ گزینی کا درجہ فراہم کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ ملک میں پناہ گزینوں اور ترک وطن کے لئے ایک قانونی ڈھانچہ کی کمی ہے۔ قانون غیر قانونی داخلے یا غیر قانونی طور پر رہنے سے متعلق قانونی دفعات سے پناہ کے خواہشمند افراد اور پناہ گزینوں کو الگ نہیں کرتا۔ پناہ گزینوں سے متعلق ایک قومی قانونی ڈھانچے کی عدم موجودگی میں یو این ایچ سی آر نے اپنے مینڈیٹ کے تحت پناہ گزین درجہ کا تعین کیا اور ملک میں پناہ گزین کا درجہ دینے سے متعلق یو این ایچ سی آر کے فیصلوں کو عمومی طور پر تسلیم کیا گیا اور پناہ کے درخواست گزاروں جو اس عمل سے گزر رہے تھے اور وہ جنہیں پناہ گزین تسلیم کر لیا گیا تھا، دونوں کو دیرپا حل کی نشاندہی تک ملک میں رہنے کی اجازت دی۔

روزگار: ایسی کوئی باقاعدہ دستاویز نہیں جس کے تحت پناہ گزینوں کو کام کرنے کی قانونی اجازت حاصل ہو، تاہم ایسا قانون بھی نہیں جو پناہ گزینوں کو ملک میں کام کرنے کی ممانعت کرتا ہو۔ کئی پناہ گزین یومیہ اجرت کے ملازمین کی حیثیت سے کام کرتے رہے یا غیر رسمی منڈیوں میں کام کر رہے تھے اور مقامی آجرین نے ان منڈیوں میں کم اجرت یا بغیر اجرت کی فراہمی کے ذریعے پناہ گزینوں کا استحصال کیا۔ خواتین اور بچے بالخصوص اس صورتحال کا شکار رہے اور کم اجرت اور ناپسندیدہ کام کرنے پر مجبور رہے۔

بنیادی سہولتوں تک رسائی: رجسٹرڈ افغانوں میں سے ایک تہائی کی رہائش ۵۴ پناہ گزین دیہات میں تھی جبکہ بقیہ دو تہائی تعداد دیہی اور شہری علاقوں میں میزبان آبادیوں میں رہائش پذیر رہی اور انہی آبادیوں میں بنیادی خدمات تک رسائی کی متلاشی رہی۔ افغان پناہ گزین پولیس اور عدالتوں کی خدمات اپنے لئے حاصل کر سکتے تھے، لیکن بعض بالخصوص غریب لوگ ایسا کرنے سے خوفزدہ رہے۔ قومیت کی وجہ سے کسی کو صحت کی سہولتوں کی فراہمی سے انکار کی اطلاعات موصول نہیں ہوئیں۔

آئین پانچ سے سولہ برس کی عمر کے تمام بچوں کے لئے ان کی قومیت سے قطع نظر مفت اور لازمی تعلیم کا تقاضہ کرتا ہے۔ یہ فرض کیا گیا کہ ہر پناہ گزین بچہ جو یو این ایچ سی آر اور افغان پناہ گزینوں کے حکومتی زیر انتظام کمشنریٹ میں رجسٹرڈ ہو، درکار کاغذی کارروائی کے بعد سرکاری تعلیمی اداروں میں داخل تھا، تاہم اسکولوں تک رسائی پرنسپل کی جانب سے جگہ کی دستیابی کے تعین پر منحصر تھی اور بیشتر رجسٹرڈ افغانوں نے نجی اسکولوں یا بین الاقوامی برادری کے تعاون سے چلنے والے اسکولوں میں داخلہ لیا۔ پناہ گزین دیہات میں بڑے طلبہ بالخصوص لڑکیوں کے لئے تعلیم تک رسائی مشکل رہی۔

پاکستان میں بڑے ہونے والے افغانوں کو جامعات میں داخلے کے لئے اسٹوڈنٹ ویزا درکار تھا، لیکن ان کے لئے اسٹوڈنٹ ویزا کے حصول کی اہلیت کا انحصار ان کے رجسٹریشن کارڈز پر تھا۔ افغان طلبہ پاکستان کے سرکاری و نجی کالجوں اور جامعات میں داخلے کے حصول کے لئے اہل تھے۔

پائیدار حل: حکومت نے دیگر ممالک سے پناہ گزین آباد ہونے کے لئے قبول نہیں کیئے اور نہ ہی ان کی مقامی آبادی میں انضمام میں مدد کی۔ حکومت فی الوقت افغان مہاجرین کے بچوں کو پاکستانی شہریت نہیں دیتی، تاہم جیسا کہ حال ہی میں اطلاعات آئی ہیں کہ حکومت نے افغان اور بنگالی پناہ گزینوں کے پاکستان میں پیدا ہونے والے بچوں کو شہریت دینے کے امکان کا جائزہ لینے کے لئے ایک پارلیمانی کمیٹی قائم کی ہے۔

ریاستی اور سرحدی امور کی وزارت اور وزارت داخلہ کی نیشنل ڈیٹابیس اینڈ رجسٹریشن اتھارٹی (نادرا) نے مئی ۲۰۱۷ء میں ملک میں غیر رجسٹرڈ افغان باشندوں کی رجسٹریشن کے لیئے مفاہمت کی ایک یادداشت پر دستخط کئے۔ یادداشت کے تحت غیر رجسٹرڈ افغانوں کی اکثریت والے علاقوں میں ۲۱ رجسٹریشن مراکز قائم کیئے گئے۔ مفاہمت کے تحت نادرا نے چھ ماہ کے عرصے میں افغان سٹیزن کارڈز کے نام سے نئے شناختی کارڈز جاری کرنے پر آمادگی ظاہر کی۔ افغان سٹیزن کارڈز نے غیر رجسٹرڈ افغانوں کو جبری گرفتاریوں، حراست یا فارنرز ایکٹ کے تحت ملک بدری سے تحفظ دیا اور ان کارڈز کی بدولت کارڈ کے حامل افغانوں کو کارڈز کی مدت ختم ہونے تک پاکستان میں رہنے کی اجازت دی گئی۔ اگر کارڈ رکھنے والے ملک چھوڑتے ہیں تو انہیں اپنی اس حیثیت سے دستبردار ہونا پڑتا ہے۔ افغان سٹیزن کارڈز کے لئے درخواست دینے کا عرصہ جنوری کے آخر میں اختتام پذیر ہوا جس کے بعد صرف ان کارڈ ہولڈرز کے ہاں پیدا ہونے والے نئے بچوں کا ریکارڈ داخل کیا گیا۔ رجسٹریشن کی مدت کے بعد ملک میں موجود غیر رجسٹرڈ افغانوں کو فارنرز ایکٹ کے تحت گرفتاری اور ملک بدری کا خطرہ لاحق رہا۔

بے وطن افراد

بے وطنی ایک بڑا مسئلہ بنی رہی۔ بے وطنی کے بارے میں کوئی بھی قانون سازی موجود نہیں ہے اور حکومت بے وطن افراد کے وجود سے انکاری ہے۔ ۱۹۴۷ء اور ۱۹۷۱ء کے بالترتیب، پاکستان۔ بھارت اور پاکستان۔ بنگلا دیش تقسیم کے نتیجے میں بین الاقوامی اور قومی اداروں کے اندازے کے مطابق ہزاروں بے وطن لوگوں کی ملک میں موجودگی کے امکانات تھے۔ اس کے علاوہ یو این ایچ سی آر نے اندازہ لگایا کہ ملک میں تین لاکھ روہنگیا باشندے رہائش پذیر تھے، جن کی بڑی تعداد کے بارے میں بے وطن ہونے کا گمان ہے۔

حصہ سوئم: سیاسی عمل میں شرکت کی آزادی

آئین شہریوں کی اکثریت کو غیر جانبدار اور منصفانہ خفیہ ووٹ کے ذریعے انتخابات میں اپنی مرضی کی حکومت منتخب کرنے کا حق دیتا ہے، جو کہ عام اور مساوی رائے دہی کے حقوق کے عین مطابق ہے۔ گلگت بلتستان، آزاد کشمیر، سابق فاٹا میں ملک کے باقی علاقوں سے مختلف سیاسی نظام نافذ ہیں۔ گلگت بلتستان اور آزاد کشمیر کو قومی پارلیمینٹ میں نمائندگی حاصل نہیں۔

سابق فاٹا کے شہریوں کی قبائلی علاقوں سے متعلق وفاقی فیصلوں میں شنوائی نہیں اور یہ اختیارات خیبر پختونخوا کے گورنر کے پاس ہیں جس کی تقرری صدرِ مملکت کرتا ہے۔۔ قبائلی علاقوں کے عوام کو اپنی مقامی حکومت منتخب کرنے کا حق حاصل نہیں کیونکہ غیر منتخب سویلین افسر شاہی ایف آئی جی آر اور اس سے قبل رائج ایف سی آر کے تحت قبائلی علاقوں کا انتظام چلاتی رہی۔ سال کے آخر تک سابق فاٹا میں مقامی حکومت کے انتخابات کا انعقاد نہیں کیا گیا، گو کہ حکومت نے ۲۰۱۱ء کے ایکسٹینشن آف پولیٹکل پارٹیز آرڈر ۲۰۰۲ء کے تحت سیاسی جماعتوں کو فاٹا میں آزادانہ طور پر کام کرنے کی اجازت دی۔ سیاسی مبصرین نے سابق فاٹا کے "کے پی" صوبے میں ۲۵ ویں ترمیم کے تحت قانونی انضمام کی تکمیل کے لئے اس حکم نامہ کو سراہتے ہوئے قبائلی ایجنسیوں میں اسے مزید مضبوط سیاسی نظام کا سنگ بنیاد قرار دیا تھا۔

آزاد کشمیر کے پاس عبوری آئین، یک ایوانی منتخب اسمبلی، وزیر اعظم اور اسمبلی سے منتخب شدہ صدر موجود ہے۔ ۲۰۱۶ء میں آزاد کشمیر نے قانون ساز اسمبلی کے انتخابات منعقد کیئے جن کے نتیجہ میں پاکستان مسلم لیگ نواز کی اکثریتی حکومت بنی۔ ذرائع ابلاغ کی اطلاعات کے مطابق مقامی مبصرین نے بیان کیا کہ انتخابات بڑی پیمانے پر پُر امن اور دھاندلی کے الزامات سے بری تھے۔ آزاد کشمیر دد الیکشن کمیشن نے امن وامان برقرار رکھنے کی غرض سے ۳۲ ہزار قانون نافذ کرنے والے اہلکار تعینات کیے۔ کچھ کشمیری سیاسی رہنماؤں نے انتخابات کے دن اضافی فوجی موجودگی کا ذکر کیا۔ وفاقی حکومت

نے، بشمول فوج، آزاد کشمیر حکومت اور اس کی انتخابی سیاست پر اپنا اثر ورسوخ برقرار رکھا۔ جو افراد آزاد کشمیر کے پاکستان کے ساتھ الحاق کی حمایت نہیں کرتے، حکومت نے ان کو سیاسی عمل، سیاسی نوکریوں اور تعلیمی اداروں سے دور رکھا۔

انتخابات اور سیاسی شرکت

حالیہ انتخابات: ۲۵ جولائی کو ملک میں براہ راست انتخابات منعقد ہوئے جن کے نتیجے میں وزیر اعظم عمران خان کی قیادت میں پی ٹی آئی کی قومی حکومت قائم ہوئی۔ آئین کی دفعہ ۴۱ کے مطابق صدر مملکت کی پانچ سالہ مدت مکمل ہونے پر الیکٹورل کالج (پارلیمینٹ کی دونوں مجالس اور صوبائی اسمبلیوں پر مشتمل) خفیہ رائے دہی کے ذریعے آئندہ صدر مملکت کا انتخاب ایک خصوصی اجلاس کے دوران کرتا ہے۔ الیکٹورل کالج نے ۴ ستمبر کو صدارتی انتخاب کا انعقاد کیا اور پی ٹی آئی کے عارف علوی کو صدر مملکت منتخب کیا۔ عارف علوی نے پی ایم ایل۔ این کے ممنون حسین کی جگہ لی جنہوں نے ۹ ستمبر کو صدارتی عہدے کی مدت مکمل کی۔

الیکشن کمیشن آف پاکستان نے عام انتخابات کے لئے اطلاعات کے مطابق لگ بھگ ۵۰ ہزار مقامی مبصرین کو اجازت دی۔ فری اینڈ فیئر الیکشن نیٹ ورک (فافن) نے، جو سول سوسائٹی کی ۵۰ تنظیموں کا اتحاد تھا، ۱۹ ہزار مبصرین تعینات کئے اور ملک بھر میں ۸۵ فیصد سے زائد پولنگ اسٹیشنوں پر ووٹ ڈالنے کے عمل کا جائزہ لیا۔ یورپی یونین نے بھی مبصرین کے مشن کو تعینات کیا۔ فری اینڈ فیئر الیکشن نیٹ ورک نے الیکشن کمیشن آف پاکستان کی جانب سے پولنگ کے عمل کے نظم و نسق میں بحیثیت مجموعی بہتری کی نشاندہی کی، تاہم نتائج جاری کرنے کے نئے الیکٹرانک نظام کی ناکامی کی وجہ سے عبوری نتائج کے اعلان میں تاخیر ہوئی جس سے عوام اور ذرائع ابلاغ پر ووٹوں کی گنتی کی صداقت سے متعلق قیاس آرائی میں اضافہ ہو گیا۔ یورپی یونین کے مبصرین نے جانچا کہ ووٹنگ بہتر اور شفاف انداز میں منعقد ہوئی، تاہم یورپی یونین نے نشاندہی کی کہ ووٹوں کی گنتی کہیں کہیں مسئلہ رہی۔ سول سوسائٹی کی تنظیموں اور سیاسی جماعتوں نے آزادی اظہار رائے پر پابندیوں، انتخاب لڑنے کے غیر مساوی مواقع سمیت قبل از انتخابی مداخلت سے متعلق تشویش کا اظہار کیا۔ بعض سیاسی جماعتوں نے پولنگ کے دن بے ضابطگیاں ہونے کا بھی الزام لگایا۔

سیاسی جماعتیں اور سیاسی عمل میں شمولیت: انتخابات میں دہشتگرد گروہوں کے ساتھ تعلق کے باعث کالعدم تنظیموں کے علاوہ کسی بھی سیاسی جماعت پر پابندی کی اطلاعات موجود نہیں تھیں۔ تاہم ذرائع ابلاغ کی خبروں کے مطابق سیکیورٹی اداروں نے سابقہ حکمران جماعت مسلم لیگ نواز سے منسلک سیاستدانوں پر وفاداریاں تبدیل کرنے کے لیئے دباؤ ڈالا اور ان کو بدعنوانی کے الزام میں قانونی کارروائی کی دھمکیاں دیں۔ ذرائع ابلاغ اور تجزیہ نگاروں نے سوالات اُٹھائے کہ کیا فوج اور عدالتوں نے کرپشن کے الزامات کو پی ایم ایل۔ این کے انتخابی حمایت کو کم کرنے کے لیئے مخصوص سیاسی رہنماؤں کے خلاف ہتھکنڈے کے طور پر استعمال کیا۔ ججوں نے ذرائع ابلاغ کی نگرانی کرنے والے اداروں کو حکم دیا کہ فوج اور عدلیہ پر تنقید کرنے والے اداروں پر آئینی پابندیاں نافذ کریں، جس کے نتیجہ میں میڈیا کو "عدلیہ مخالف" اور "فوج مخالف" سمجھی جانے والی الیکشن کوریج اور سیاستدانوں کی تقاریر کو سینسر کرنا پڑا۔ ذرائع ابلاغ کی آزادی پر کام کرنے والی غیر سرکاری تنظیموں کی رپورٹوں کے مطابق میڈیا کے اداروں پر اس کے بارے میں براہ راست دباؤ تھا کہ سیاست دانوں کے خلاف قانونی کارروائی کے لیئے عدلیہ پر ممکنہ عسکری اثر ورسوخ کے بارے میں مواد نشر نہ کیا جائے اور یہ بھی کہ نواز لیگ کے سیاسی رہنماؤں کے بارے میں مثبت خبریں نہ چلائی جائیں۔ بہت سے علاقوں میں سیاسی جماعتوں اور امیدواروں پر اکثر علاقوں میں اجتماع کرنے، انتخابات میں حصہ لینے، ووٹ حاصل کرنے یا عوامی رائے کا اظہار کرنے میں کوئی مداخلت

نہیں تھی۔ بلوچستان میں، اگرچہ رپورٹیں تھی کہ سیکیورٹی ایجنسیوں اور علیحدگی پسند گروپوں نے مقامی سیاسی تنظیموں کو، مثال کے طور پر بلوچستان نیشنل پارٹی اور بلوچ اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن، ہراساں کیا۔

خواتین اور مذہبی اقلیتوں کی شرکت: ملک میں عورتوں کو ووٹنگ سے روکنے کا کوئی بھی قانون رائج نہیں، لیکن قبائلی اور دیہی علاقوں میں رائج روایتی اور ثقافتی رسم ورواج نے کچھ عورتوں کو ووٹنگ میں حصہ لینے سے دور رکھا۔ حکام نے منتخب اداروں میں عورتوں کی کم از کم موجودگی یقینی بنانے کے لیئے وسیع طور پر کوٹہ سسٹم کا استعمال کیا۔ قومی اسمبلی میں عورتوں کے لیئے ۶۰ اور سینیٹ میں ۱۷ مخصوص نشستیں ہیں۔ حکام نے ان نشستوں کو ہر پارٹی کی جانب سے الیکشن لڑ کر کامیاب ہونے والے امیدوار کی جانب سے حاصل کیئے گئے ووٹوں کی بنیاد پر تقسیم کیا۔ حکام نے صوبائی اسمبلی کی ۷۵۸ میں سے ۱۲۹ سیٹیں خواتین کے لئے مختص کیں اور مقامی کونسلوں میں ایک تہائی نشستیں فراہم کیں۔ خواتین نے بطور سیاسی جماعتوں کے کارکن سرگرم کردار ادا کیا لیکن وہ سیاسی جماعتوں میں ماسوائے خواتین ونگ، زیادہ تر قائدانہ عہدے حاصل کرنے میں کامیاب نہیں رہیں۔ خواتین نے وفاقی کابینہ میں بھی خدمات سرانجام دیں۔

۲۰۱۷ء میں پاس ہونے والے جامع انتخابات ایکٹ ۲۰۱۷ء میں خواتین، مذہبی اقلیتوں، خواجہ سراؤں اور معذور افراد کی انتخابی عمل میں شرکت میں اضافے کے لیئے خصوصی اقدامات پر زور دیا گیا ہے۔ نئے قانون کے تحت پارٹی کے پانچ فیصد ٹکٹ لازمی طور پر خواتین کو دیئے جائیں اور اگر کسی حلقہ میں دس فیصد سے کم خواتین ووٹ ڈالتی ہیں تو یہ تصور کیا جائے گا کہ عورتوں کے ووٹ کو دبایا گیا ہے اور اس حلقے یا پولنگ اسٹیشن کے نتائج مسترد کئے جاسکتے ہیں۔ اس قانون پر پہلی بار خیبر پختونخوا کے علاقہ شانگلہ میں اس وقت عمل درآمد ہوا جب الیکشن کمیشن نے ضلع کے اندر جولائی میں ہونے والے عام انتخابات کے نتائج اس بنیاد پر مسترد کر دیئے کہ خواتین کے ڈالے گئے ووٹ دس فیصد سے کم تھے۔ مذکورہ قانون معذور افراد کو بذریعہ ڈاک ووٹ کا حق فراہم کرتا ہے۔ یہ غیر مسلم، خواجہ سراؤں اور معذوروں کو قومی شناختی کارڈ (جو ووٹر کی شناختی دستاویز کے طور پر استعمال ہوتا ہے) کے جلد از جلد اجراء پر زور دیتا ہے۔

حکومت ووٹروں پر لازمی قرار دیتی ہے کہ ووٹ کا اندراج کراتے وقت اپنا مذہب ظاہر کریں اور احمدیوں کے لیئے لازمی ہے کہ خود کو غیر مسلم قرار دیں۔ احمدی خود کو مسلمان سمجھتے ہیں اور ان میں سے بہت سارے مذکورہ قانون کی پاسداری نہ کرنے کے باعث حق رائے دہی استعمال کرنے سے رہ گئے۔

سرکاری تشریح میں "غیر مسلم" قرار دی گئی مذہبی اقلیتوں کے لیئے آئین ایوان بالا سینٹ میں چار نشستیں یعنی ہر صوبہ میں سے ایک نشست مختص کرنے کا حکم دیتا ہے۔ یہ نشستیں صوبائی اسمبلیوں میں منعقد ہونے والے بالواسطہ انتخابات کے ذریعے پُر کی جاتی ہیں۔ قومی اسمبلی کی دس نشستیں مذہبی اقلیتوں کے لیئے مخصوص ہیں۔ حکام نے یہ نشستیں سیاسی جماعتوں کے درمیان قومی اسمبلی میں ان کی جانب سے جیتی گئی ہر ایک سیٹ کے فیصد کے حساب سے تقسیم کیں۔ اقلیتوں کے پاس صوبائی اسمبلیوں میں بائیس مخصوص نشستیں تھیں: پنجاب میں آٹھ، سندھ میں نو، خیبر پختونخوا میں دو اور بلوچستان میں تین۔ مذہبی اقلیتی برادری کے کچھ ارکان نے اقلیتوں کی نمائندگی کے مذکورہ طریقہ کار پر تنقید کی کیوں کہ اس کے تحت اقلیتی نمائندے صوبائی اور وفاقی سطح پر ان کی سیاسی جماعتوں کے جانب سے مخصوص سیٹوں پر مقرر کیئے جاتے ہیں۔ ان کا مؤقف یہ تھا کہ اس نظام میں

منتخب افراد اقلیتی برادری کے بجائے اپنی سیاسی جماعت کے مفادات کے لئے کام کرتے ہیں۔ خواتین اور اقلیتیں غیر مخصوص نشستوں پر بھی الیکشن لڑ سکتے ہیں۔

سیکشن چہارم: بدعنوانی اور حکومتی اُمور میں عدم شفافیت

قانون بدعنوان افسران کے خلاف مجرمانہ سزاؤں پر زور دیتا ہے، لیکن حکومت نے اس قانون کو مؤثر طریقے سے نافذ نہیں کیا اور افسران اکثر و بیشتر بدعنوانی کے عمل میں ملوث رہے۔ گزشتہ برسوں کی طرح سیاست اور حکومت میں کرپشن چھائی ہوئی تھی اور مختلف سیاستدانوں اور سرکاری عہدیداروں پر رشوت خوری، بھتہ خوری، نااہل رشتہ داروں اور ساتھیوں کی تقرری، اقرباء پروری، جرائم کی سرپرستی، دھوکہ دہی اور خُرد برد کے الزامات تھے۔

بدعنوانی: قومی احتساب بیورو (نیب) اعلیٰ سطح کے انسداد بدعنوانی ادارے کے طور پر خدمت سرانجام دیتا ہے، جس کا مینڈیٹ آگہی، روک تھام اور نفاذ قانون کے اقدامات کی توسط سے بدعنوانی کا خاتمہ کرنا ہے۔ نیب اور دوسرے تفتیشی ادارے بشمول وفاقی ریوینیو بورڈ، بینک دولت پاکستان اور وفاقی تحقیقاتی ادارہ (ایف آئی اے) کرپشن، ٹیکس چوری اور منی لانڈرنگ کے جرائم کی تحقیقات کرتے ہیں۔

سیکشن پنجم: انسانی حقوق کی مبینہ پامالیوں سے متعلق بین الاقوامی اور غیر سرکاری تحقیقات میں حکومتی رویہ

کچھ مقامی اور بین الاقوامی حقوق انسانی کے ادارے اپنا کام، تحقیق اور متعلقہ مقدمات پر اپنی تحریریں حکومتی پابندیوں کے بغیر شائع کرتے رہے۔ حکومت نے این جی اوز کے کام کی استعداد کو مسلسل کم کرنے کی کوشش کی۔ کچھ ادارے جنہوں نے غلط کاموں میں حکومت، فوج اور حساس اداروں کی نشاندہی کی یا ایسے ادارے جو بدامنی کے شکار علاقوں میں کام کر رہے تھے یا وہاں کوئی مہم چلا رہے تھے انہوں نے دعویٰ کیا کہ ان کے کام کو محدود کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ان اداروں کو ویزہ کے حصول، سفر، اور رجسٹریشن کے حوالے سے کئی قوانین کا سامنا کرنا پڑا جو نہ صرف ان اداروں کے کام پر اثر انداز ہوئی بلکہ فنڈز کے حصول کو بھی متاثر کیا۔ اداروں کے غیر مقامی ممبران بشمول بعض ایسی این جی اوز جو کامیابی سے رجسٹریشن کروا چکی تھی انہیں ویزے کے حصول اور اندرون ملک سفر کے لیئے اجازت نامہ لینے میں تاخیر کا سامنا کرنا پڑا۔ مقامی این جی اوز کے رجسٹریشن معاہدے کے تحت یہ این جی اوز اپنے کاغذات، خط و کتابت اور معاہدات میں امن اور بدامنی کے خاتمے، اندرون ملک بے گھر افراد اور اس طرح کی اصطلاحات استعمال نہیں کریں گی۔ اس معاہدے کی رو سے یہ ادارے بھارتی یا اسرائیلی شہریت کے حامل افراد کو ملازمت فراہم نہیں کر سکتے۔ محض چند این جی اوز کو صوبہ خیبر پختونخوا، سابقہ قبائلی علاقوں اور بلوچستان کے کچھ علاقوں تک رسائی حاصل تھی۔

حقوق انسانی کے حکومتی ادارے: قومی کمیشن برائے حقوق انسانی بل ۲۰۱۲ء کے تحت ایک آزاد کمیٹی کی تشکیل عمل میں لائی جاسکتی ہے، ۲۰۱۵ء میں نیشنل کمیشن برائے حقوق انسانی اور حقوق انسانی کی وزرات کی تشکیل نو عمل میں لائی گئی۔ ایوان بالا سینٹ اور قومی اسمبلی کی اسٹینڈنگ کمیٹی برائے قانون، انصاف، اقلیتوں اور حقوق انسانی نے درپیش مسائل پر متعدد نشستیں منعقد کی۔

سیکشن ششم: امتیازی سلوک، معاشرتی بدسلوکی اور بردہ فروشی

خواتین

عصمت دری اور گھریلو تشدد: عصمت دری ایک سنگین جرم ہے جسکی پاداش میں دس سے پچیس سال قید، جرمانہ اور بعض صورتوں میں پھانسی کی سزا دی جاسکتی ہے۔ اجتماعی زیادتی کی سزا عمر قید یا سزائے موت ہے۔ شریک حیات سے جنسی زیادتی جرم میں شمار نہیں ہوتی اور اس جرم میں صرف مرد اور متاثرہ خاتون کا ذکر ہے۔ اگرچہ جنسی زیادتی کے واقعات بار بار ہوتے رہے، لیکن مقدمہ شاذ و نادر ہی درج ہوا۔ ۲۰۱۶ء میں پارلیمینٹ نے جنسی زیادتی کی روک تھام کا نیا قانون پاس کیا، جس میں ڈی این اے حاصل کرنے اور جنسی زیادتی کے متاثرہ فرد کا نام ظاہر نہ کرنے، متاثرہ فریق کو قانونی مدد حاصل کرنے کا حق، جبکہ ذہنی اور جسمانی طور پر معذور کی عصمت دری کی سزاؤں میں اضافہ تجویز کیا گیا۔

حکومت نے ۲۰۰۶ء کے خواتین کے تحفظ کے بل کو موثر طور پر نافذ نہیں کیا جس کی رو سے جنسی زیادتی کے کیس اسلامی عدالتوں کی بجائے فوجداری عدالتوں کے ماتحت لایا گیا۔ قانونی طور پر پولیس ایک خاتون کو دیوانی عدالت کے جج کی منظوری کے بغیر رات تھانے میں نہیں رکھ سکتی۔ قانون متاثرہ پارٹی کو حق دیتا ہے کہ وہ براہ راست سیشن جج سے دادرسی طلب کر سکتا ہے جو سنگین جرائم کے لیئے ٹرائل کورٹ تصور کی جاتی ہے۔ متاثرہ خاتون کا بیان لینے کے بعد، سیشن کورٹ باقاعدہ شکایت درج کرتی ہے، جس کے بعد پولیس گرفتاریاں عمل میں لاسکتی ہے۔ این جی اوز نے رپورٹ کیا کہ اس طریقہ ہائے کار نے جنسی زیادتی کے ان متاثرین کے لیئے رکاوٹیں پیدا کیں، جو عدالت کی طرف سفر یا رسائی کی طاقت نہیں رکھتے۔ جنسی زیادتی ایک ایسا جرم رہا جس کی بہت کم اطلاع دی گئی۔

۲۰۱۶ء میں پنجاب کی صوبائی حکومت نے خواتین پر ہونے والے تشدد کیخلاف تشدد سے تحفظ کا قانون پاس کر کے گھریلو تشدد کے متاثرین کو زیادہ قانونی تحفظ، بشمول عدالتی حفاظتی احکامات اور ضلعی سطح کے نئے دارالامان تک رسائی فراہم کی، جن میں سے سب سے پہلا مرکز مارچ ۲۰۱۷ء میں ملتان میں شروع کیا گیا۔ یہ مرکز خواتین کو بہت ساری خدمات فراہم کرتا ہے، بشمول ان کے خلاف صادر ہونے والے جرائم کی ایف آئی آر کی تکمیل، بنیادی طبی امداد، طبی معائنہ، بعد از صدمہ بحالی، مفت قانونی اعانت اور دارالامان شامل ہیں۔

قانون نافذ کرنے والے اداروں کی جانب سے اعداد و شمار جمع کرنے کے مرکزی نظام کی عدم دستیابی اور جنسی زیاتی کے بارے میں بہت کم اطلاع دیئے جانے کی وجہ سے ان واقعات کے بارے میں کوئی بھی قابل اعتماد اعداد و شمار قومی، صوبائی اور مقامی سطح پر دستیاب نہیں تھے۔

رپورٹ شدہ جنسی زیادتی کے واقعات میں قانونی کارروائی کبھی کبھار ہوئی، اگرچہ ایسی رپورٹس موصول ہوئیں کہ جنسی زیادتی اور صنفی بنیاد پر تشدد کیخلاف عوام اور پولیس میں شعور اور اداروں کی استعداد کار میں اضافے کی کوششوں سے اس امر میں بہتری دیکھی گئی۔ پولیس اور این جی اوز کے مطابق، دیگر تنازعات میں ملوث افراد نے بعض اوقات ایک دوسرے کے خلاف جنسی زیادتی کے جھوٹے مقدمات دائر کیے، جس سے پولیس کی سچے واقعات کی نشاندہی کر کے قانونی چارہ جوئی کی صلاحیت متاثر ہوئی۔ این جی اوز نے پولیس پر الزام لگایا کہ اس نے بعض اوقات جنسی زیادتی کا ارتکاب کرنے والوں سے رشوت وصول کی اور متاثرین کا استحصال کیا اور انہیں دھمکایا کہ وہ الزام واپس لے لیں، خاص طور پر جب مجرموں کا تعلق کسی اثر رسوخ والی برادری سے تھا۔ کچھ پولیس افسروں نے متاثرہ فریق سے جنسی زیادتی کا مقدمہ درج کرنے سے قبل رشوت طلب کی، اور بسا اوقات تفتیش

فقط خانہ پُری کے طور پر کی گئی۔ مزید براں جنسی زیادتی کے الزامات ماورائے قانون طریقوں سے حل کیئے گئے جس میں کئی مرتبہ متاثرہ خاتون کی مجرم سے زبردستی شادی کروائی گئی۔

بعد از زیادتی طبی معائنہ کے رجحان میں اضافہ ہوا لیکن بہت سے علاقوں میں طبی عملہ کے پاس مناسب تربیت یا آلات نہیں تھے، جو کہ قانونی کارروائی میں مزید پیچیدگی کا باعث بنا۔ جنسی زیادتی کی شکار خواتین، خصوصاً دیہی خواتین کو علاج معالجے کی جامع سہولیات تک رسائی حاصل نہیں تھی۔ خواتین کے طبی مراکز کم تعداد میں میسر تھے جنہیں وفاقی حکومت اور بین الاقوامی خیراتی ادارے معاونت فراہم کر رہے تھے۔ یہ مراکز مقامی مراکز کے ساتھ شراکت داری کے ذریعے جنسی زیادتی کی شکار خواتین کو بنیادی سہولیات کی فراہمی کا انتظام کرتے۔

معاشرے میں عام ہونے کہ باوجود کوئی خاص وفاقی قانون گھریلو تشدد کی ممانعت نہیں کرتا۔ گھریلو تشدد کے واقعات اطلاعات کے مطابق مار پیٹ، اعضاء کاٹنے، خواتین کی ابرو یا بال مونڈھنا اور۔ زیادہ شدید معاملات میں۔ قتل شامل تھے۔ سسرال والوں نے اپنی بہوؤں کو ہراساں کیا۔ جہیز اور دیگر خاندانی تنازعات کا نتیجہ کبھی کبھار موت یا جلا کر یا تیزاب پھینک کر شکل بگاڑ دینے کی صورت میں نکلا۔

جن عورتوں نے ظلم کے خلاف مقدمہ درج کروانا چاہا ان کو گھمبیر مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ پولیس اور جج بعض اوقات گھریلو تشدد کے واقعات کو خاندانی تنازعات کے پس منظر میں دیکھ کر، کوئی قدم اٹھانے سے کتراتے تھے۔ فرد جرم عائد کرنے کے بجائے پولیس نے فریقین کی حوصلہ افزائی کی کہ وہ آپس میں صلح کر لیں۔ حکام جبر کی شکار عورتوں کو بدسلوکی کے مرتکب خاندانوں میں واپس کرنے کے دستور پر عمل پیرا تھے۔

صنفی بنیادوں پر تشدد اور بدسلوکی کی اطلاع دینے والی خواتین کے بارے میں منفی معاشرتی روایات کو توڑنے کے لیئے حکومت نے خواتین کے لیئے خصوصی پولیس اسٹیشن قائم کر کے خواتین اہلکار مقرر کیں تاکہ متاثرہ عورتوں کو ایسی محفوظ پناہ گاہ میسر کی جاسکے جہاں وہ محفوظ انداز میں شکایات درج کروا سکیں اور مقدمات رپورٹ کر سکیں۔ تاہم خواتین کے یہ پولیس اسٹیشن اسٹاف کی کمی اور محدود سامان کے ساتھ مشکلات کا شکار رہے۔

حکومت نے مشکلات کی شکار خواتین کے لیئے ہنگامی مرکز چلانا بھی جاری رکھے، جن کے توسط سے، زیادتی کی شکار خواتین کو غیر سرکاری تنظیموں کی جانب مدد حاصل کرنے کے لیئے بھیجا گیا۔ سرکاری مالی امداد سے ملک بھر میں قائم شہید بینظیر بھٹو مراکز برائے خواتین نے قانونی امداد، طبی علاج اور نفسیاتی مشاورت فراہم کی۔ یہ مراکز ایسی خواتین کو خدمات فراہم کرتے ہیں جو استحصال اور تشدد کا شکار تھیں۔ بعد ازاں متاثرین کو دار الامان کے حوالے کیا گیا، زیادتی کا شکار خواتین اور بچوں کے لیئے یہ پناہ گاہیں ملک بھر میں سینکڑوں کی تعداد میں تھیں۔ دارالامان نے طبی علاج کی سہولت بھی فراہم کی۔ تاہم غیر سرکاری تنظیموں کے مطابق ان مراکز نے خواتین کو کئی شعبوں مثلاً قانونی رہنمائی یا مشاورت وغیرہ کی پیشکش نہیں کی اور وہ اکثر زنا کے مقدمات کی سماعت کی منتظر خواتین کے لیئے، جو عصمت دری اور گھریلو بدسلوکی کا شکار تھیں، بطور انتظار گاہ ہی کام آئے۔

سرکاری مراکز میں مناسب جگہ، عملے اور وسائل کی کمی تھی۔ بہت سے دار الامان کے اندر حالات بین الاقوامی معیار کے مطابق نہیں تھے اور کئی تو گنجائش سے زیادہ بھرے ہوئے تھے۔ چند پناہ گھروں میں بنیادی ضروریات جیسے نہانے، کپڑے دھونے کے سامان یا نسائی حفظان صحت کی مصنوعات کی سہولیات میسر نہیں تھی۔ بعض واقعات میں خواتین کے ساتھ سرکاری پناہ گھروں میں مبینہ طور پر بدسلوکی کی گئی، ان کی نقل و حرکت پر پابندی لگائی گئی یا ان پر دباؤ ڈالا گیا کہ وہ ظلم کرنے والوں کے پاس واپس جائیں۔

عورتوں کو پناہ گاہوں سے باہر بھیجنے اور بدکاری کے دھندے میں ملوث کرنے کے حوالے سے کچھ اطلاعات تھیں۔ پناہ گاہوں کے عملے نے مبینہ طور پر خواتین کے ساتھ اس مفروضے کی بنیاد پر امتیازی سلوک کیا کہ وہ اس لیئے گھر سے بھاگ کر آئی ہیں کیونکہ وہ غلط شہرت رکھنے والی عورتیں تھیں۔

عورتوں کے ختنہ کا معاملہ: کوئی بھی ملکی قانون عورتوں کے ختنے کے حوالے سے رہنمائی فراہم نہیں کرتا۔ انسانی حقوق کے گروپوں اور ذرائع ابلاغ کی رپورٹوں کے مطابق بہت سے داؤدی بوہرہ مسلمانوں نے عورتوں کے ختنہ کے مختلف طریقوں پر عملدرآمد کیا۔ کچھ داؤدی بوہرہ افراد نے کھلے عام اس موضوع پر بات چیت کی اور اس عمل کے خلاف آن لائن درخواستوں پر دستخط کیے۔ دیہی سندھ اور بلوچستان میں کچھ الگ تھلگ رہنے والے قبائل اور کمیونٹی بھی اس پر عملدرآمد کرتے ہیں۔

دیگر خطرناک روایتی طریقے: بعض اوقات خواتین مختلف قسم کے سماجی تشدد اور بدسلوکی کا شکار رہیں، جن میں نام نہاد غیرت کے نام پر قتل، زبردستی شادی اور مذہب تبدیل کرنا، جبری تنہائی، اور قبائلی تنازعات کو حل کرنے کے لیئے ملکیت کے طور پر استعمال کیا جانا شامل ہے۔ ۲۰۰۴ء کا غیرت کے نام پر قتل کے حوالے سے قانون، ۲۰۱۱ء کا عورت مخالف کارروائیوں کی روک تھام کا ایکٹ اور ۲۰۱۶ء میں فوجداری قانون میں ترامیم غیرت اور روایتی طریقوں سے خواتین کے خلاف تشدد کو قابل سزا جرم قرار دیتا ہے۔ لیکن ان قوانین کے باوجود، سینکڑوں خواتین نام نہاد غیرت کے نام پر قتل ہوئیں اور بہت سارے واقعات کے مقدمات درج ہوئے نہ ہی کسی کو سزا دی گئی۔ چونکہ ایسے واقعات خاندان کے اندر ہی رونما ہوتے ہیں، لہذا بہت سے مقدمات میں نام نہاد غیرت کی پامالی میں ملوث مرد کو قتل نہیں کیا جاتا بلکہ فرار ہونے کا موقعہ دیا جاتا ہے۔ پولیس اور این جی اوز نے اطلاع دی کہ ذرائع ابلاغ میں بڑھتی ہوئی کوریج نے قانون نافذ کرنے والے اداروں کو ان واقعات میں ملوث افراد کے خلاف کارروائی کے قابل بنانے میں مدد دی ہے۔

چھ اپریل کو خیرپور سندھ میں ایک مرد نے اپنی حاملہ بہن کو اس بات پر قتل کر دیا کہ اس نے دوسری ذات کے مرد سے شادی کی تھی۔ یہ قتل 'ناپاکی' کے الزام کے تحت مقامی جرگہ کہ سامنے خاتون کی پیشی سے ایک دن قبل ہوا۔ چودہ مارچ کو جنوبی سندھ کے علاقے بدین میں ایک شخص نے بدکرداری کے شبے میں اپنی بیوی کو قتل کر دیا۔ جولائی میں خیبر پختونخوا کے علاقے مسترزئی میں ایک شخص نے غیرت کے مبینہ قتل میں اپنی بیوی کو کرنٹ لگا کر مار دیا۔ حکام نے ملزم کو گرفتار کیا مگر یہ واضح نہیں ہے کہ اس کے خلاف قانونی چارہ جوئی اختیار کی گئی یا نہیں۔ میڈیا کے مطابق ستمبر میں ایک اکیس سالہ نوجوان اور اٹھارہ سالہ لڑکی کو دوستی کے شبے میں لڑکی کے والد اور چچا نے قتل کر دیا، پولیس نے دونوں ملزمان کو گرفتار کر لیا اور ان کے خلاف قتل کا مقدمہ درج کر لیا گیا۔

غیرت سے متعلقہ جرائم میں خواتین کے ناک اور کان کاٹنے کے واقعات رپورٹ ہوئے، لیکن قانونی سزائیں شاذونادر ہی دیکھنے میں آئیں۔

مارچ میں پارلیمنٹ نے وفاقی ہندو شادی ایکٹ پاس کیا۔ یہ قومی قانون ہندو برادری کی شادیوں کا اندراج کرنے اور انہیں قانونی طور پر درست ثابت کرنے کے لیئے قانونی طریقہ کار فراہم کرتا ہے۔ اگرچہ ہندو برادری کے رہنما اس قانون سازی کو ہندوؤں کی مسلمانوں کے ساتھ جبری شادیاں روکنے کے لیئے مثبت قدم قرار دیتے ہیں، لیکن اس قانون میں یہ نکتہ بھی شامل ہے کہ کسی ایک فریق کی جانب سے ہندوازم کے علاوہ کوئی اور مذہب اختیار کرنے کی صورت میں یہ شادی ٹوٹ جائے گی۔ سندھ کے ہندو میرج ایکٹ ۲۰۱۶ء میں بھی اسی قسم کی شق شامل تھی۔

خواتین مخالف روایات کے خاتمے کا ترمیمی ایکٹ ۲۰۱۱ء ان ساری روایات کو جرم قرار دیتا ہے جن میں کسی بھی دیوانی یا فوجداری مقدمہ کے تصفیہ کی غرض سے عورت کو شادی کے لیئے پیش کیا جائے؛ عورت کو دھوکہ دہی یا غیر قانونی طریقوں سے ملکیت کے حق وراثت سے محروم کیا جائے؛ حق غصب کیا جائے یا کسی بھی طریقہ سے عورت کو زبردستی شادی کے لیئے مجبور کیا جائے؛ یا قرآن پاک کے ساتھ شادی کرنے پر مجبور کیا جائے، ایسی شادی کا انتظام یا سہولت بہم پہنچائی جائے، بشمول قرآن پاک پر عورت سے یہ حلف لینے کے کہ وہ غیر شادی شدہ رہے گی اور جائداد میں حق وراثت طلب نہیں کرے گی، شامل ہیں۔ قانون کی طرف سے عائد کردہ پابندی کے باوجود کچھ علاقوں میں ان روایات پر عمل جاری رہا۔ قانون کوئی بھی جلانے والا مواد استعمال کرتے ہوئے زخمی یا قتل کرنے کو سنگین جرم قرار دے کر اس قسم کے جرائم کے مرتکب افراد کے خلاف سخت سزا تجویز کرتا ہے۔ دیگر قوانین کے ساتھ یہ اقدامات بھی سابقہ فاٹا اور پاٹا میں قابل عملدرآمد نہیں تاوقتیکہ صدر مملکت ان کے نفاذ کا حکم نامہ جاری کریں۔ ملک میں عورتوں کے اوپر تیزاب پھینکنے کے بیشمار واقعات ہوئے لیکن ان میں سے کچھ ہی واقعات کے ملزمان کو انصاف کے کٹہرے میں لایا جاسکا۔

نیشنل کمیشن آن دی اسٹیٹس آف ویمن بل ۲۰۱۰ء (خواتین کی حیثیت کے بارے میں قانون) عورتوں کے حقوق کی خلاف ورزیوں کی تفتیش کی خاطر کمیشن کو مالی اور انتظامی خود مختاری فراہم کرتا ہے لیکن عورتوں کے حقوق کے لیئے سرگرم کارکنوں کے بقول اس کمیشن کے پاس وسائل کی کمی تھی اور یہ بے اختیار رہا۔

جنسی ہراسگی: ملازمت کی جگہ اور عوامی مقامات پر جنسی ہراسگی کو جرم قرار دیئے جانے کے قوانین کی موجودگی کے باوجود یہ مسئلہ بڑے پیمانے پر موجود رہا۔ قانون سارے صوبوں پر لازمی قرار دیتا ہے کہ صوبائی سطح پر محتسب مقرر کریں۔ سندھ، صوبہ پنجاب۔ خیبر پختونخوا اور گلگت بلتستان نے بھی محتسب کے ادارے قائم کیے۔

آبادی پر قابو پانے کے لئے جبر: ملک میں زبردستی اسقاط حمل، غیر رضاکارانہ نس بندی یا آبادی پر کنٹرول کے دیگر جبری طریقوں کے اطلاعات نہیں تھیں۔

تفریق: قانون عام طور پر صنف کی بنیاد پر تفریق کرنے سے روکتا ہے، لیکن حکام نے اس قانون کو نافذ نہیں کیا۔ عورتوں کو ملازمت، عائلی قوانین، جائداد کے قانون اور عدالتی نظام میں امتیاز کا سامنا کرنا پڑا۔ عائلی قانون طلاق کے معاملات میں خواتین کو تحفظ فراہم کرتا ہے بشمول نان نفقہ کے چھوٹے بچوں کی سپرداری اور نان نفقہ کے حوالے سے رہنمائی فراہم کرتا ہے- قانون بچیوں کو بچوں کی بہ نسبت ملکیت میں آدھے حصے کا وارث بناتا ہے۔ بیویوں کو ان کے شوہر کی جائداد کا آٹھواں حصہ ورثہ میں ملتا ہے، لیکن

عورتوں کو اکثر اپنے قانونی حق سے بہت کم حصہ دیا گیا۔

اطفال

پیدائش کا اندراج: ملک کی شہریت کا حق ملک کے اندر پیدائش کی صورت میں ملتا ہے، اگرچہ سنہ ۲۰۰۰ء کے بعد بیرون ملک پیدا ہونے والے بچوں کے لیئے شہریت اس نسبت سے دی جاسکتی ہے کہ ان اگر والدہ یا والد ملک کے شہری ہوں اور بچے کا مجاز حکام کے پاس اندراج موجود ہو۔ (ملاحظہ کیجئے سیکشن دو کا حصہ "د")

تعلیم: آئین حکم صادر کرتا ہے کہ پانچ سے سولہ سال کی عمر کے تمام بچوں کو حکومت کی جانب سے مفت تعلیم فراہم کی جائے تاہم اس سہولت کے باوجود سرکاری اسکولوں نے والدین سے کتابوں، وردی اور دیگر سامان کی مد میں پیسے وصول کیے۔

طبی سہولیات: لڑکوں اور لڑکیوں دونوں کو سرکاری صحت مراکز تک رسائی حاصل تھی، اگرچہ ان کے خاندان والے بسا اوقات لڑکیوں کی نسبت لڑکوں کو طبی امداد کے لیئے ترجیح دیتے تھے۔

بچوں سے بدسلوکی: بچوں سے بدسلوکی عام تھی۔ آجروں نے، جو بعض جگہوں پر رشتہ دار تھے، گھریلو ملازمین کے طور پر کام کرنے والی چھوٹی لڑکیوں اور لڑکوں کو مار پیٹ اور ان سے دیر تک کام کروا کر بدسلوکی کی۔ ان میں سے بہت سے بچے اسمگل بھی کئے گئے۔

مقامی بااثر افراد نے بچوں کو تکلیف دہ رسومات کی بھینٹ چڑھایا۔ لڑکیوں کو تنازعہ کے تصفیہ اور واجب الادا قرض کے معاوضہ میں دیا گیا۔ ۲۰۱۶ء میں حکومت نے کمسن سے جنسی زیادتی کے انسداد کے قانون میں ترمیم کی، جس میں کم عمر کی تشریح ۱۶ برس سے کم عمر کی لڑکیوں کے ساتھ جنسی زیادتی تھی اور اس میں لڑکوں کو بھی شامل کیا گیا۔

کم عمری میں اور زبردستی کی شادی: قانونی پابندیوں کے اطلاق کے باوجود بچوں کی شادیاں انجام پائیں۔ وفاقی قانون شادی کے لیئے مردوں کی عمر ۱۸ سال جبکہ عورتوں کی ۱۶ سال مقرر کرتا ہے۔۔ صوبہ سندھ میں سندھ چائلڈ میرج ریسٹرینٹ ایکٹ ۲۰۱۴ء کے تحت لڑکیوں اور لڑکوں دونوں کے لیئے شادی کی قانونی عمر ۱۸ سال کر دی گئی ہے۔ فروری ۲۰۱۷ء میں فوجداری قانون میں ترمیم کے تحت مذکورہ قانون کی پامالی کرنے والے کی سزا میں اضافہ کیا گیا۔ ترمیم کے تحت اب خلاف ورزی کرنے والے کو کم از کم پانچ سال اور زیادہ سے زیادہ دس سال تک (گذشتہ قانون میں ایک مہینہ تک سزا تھی) سزا ملے گی اور ماضی میں مقرر کردہ ایک ہزار روپے (سات ڈالر) کی نسبت اب دس لاکھ روپے (سات ہزار دو سو ڈالر) جرمانہ لاگو کیا جائے گا۔

۲۰۱۴ء میں اسلامی نظریاتی کونسل نے بچپن میں شادی کی روک تھام کے قانون کو غیر اسلامی قرار دیتے ہوئے فتویٰ دیا کہ مذکورہ قانون غیر منصفانہ ہے اور شادی کے لیئے کوئی بھی قانونی عمر مقرر نہیں ہو سکتی۔ کونسل نے کہا کہ اسلام کم عمری کی شادی کی ممانعت نہیں کرتا کیوں کہ رخصتی تو دونوں شریک حیات کے بالغ ہونے پر ہی ہو سکتی ہے۔ کونسل کے فیصلے کو تسلیم کیا جانا لازم نہیں۔

۲۰۱۷ء میں قومی سطح پر کئے گئے گیلپ سروے کے مطابق ۲۴ اعشاریہ ۷ فیصد خواتین کی شادی ۱۸ سال سے کم عمر میں ہوئی۔ دیہی علاقوں میں غریب

والدین نے بعض اوقات اپنی بیٹیوں کو شادی کے لیئے فروخت کیا اور بعض صورتوں میں قرض ادا کرنے یا تنازعات کے تصفیہ کے لیئے بھی استعمال کیا گیا۔ اگرچہ زبردستی کی شادی ایک سنگین جرم ہے اور بہت سے مقدمات بھی درج ہوئے لیکن اس کی انسداد کے لیئے قانونی چارہ جوئی کی شرح نہ ہونے کے برابر تھی۔

بچوں کا جنسی استحصال: سنہ ۲۰۱۶ء میں پارلیمینٹ نے بچوں کو فحش فلمسازی، جنسی زیادتی، فحاشی کی ترغیب اور ظلم وستم کے مخصوص جرائم سے محفوظ رکھنے کے لیئے فوجداری قانون میں ترمیم کی۔ ۱۹۶۱ء میں نافذ ہونے والا انسداد جسم فروشی آرڈیننس اور تعزیرات پاکستان کی بعض شقیں بچوں کو معاشرتی اور معاشی حالات کے عذر کی وجہ سے جنسی استحصال کا شکار ہونے بشمول بدکاری کے لیئے غیر قانونی منتقلی سے محفوظ رکھنے کے لیئے مخصوص ہیں لیکن سرکاری حکام نے ان قوانین کو باقاعدگی کے ساتھ نافذ نہیں کیا۔ عریانی وفحاشی سے متعلقہ قوانین کے تحت، بچوں کی فحش فلمیں بنانا غیر قانونی ہے۔

کمسن بچوں کا قتل یا معذور بچوں کو مارنا: غیر سرکاری تنظیموں کے مطابق جنوری ۲۰۱۷ء اور اپریل ۲۰۱۸ء کے درمیان ساڑھے تین سو سے زیادہ بچوں کی نعشیں کوڑے کے ڈھیروں پر ملیں، جن میں ننانوے فیصد نوزائیدہ بچیاں تھیں۔ قانون کے مطابق، اگر کوئی کسی معصوم بچے کو ترک کر دیتا ہے تو اس کو سات سال تک قید کی سزا ہو سکتی ہے، جب کہ اگر کوئی معصوم بچے کو خفیہ طور پر دفناتے ہوئے پکڑا گیا تو اس کو دو سال قید کی سزا ہو سکتی ہے۔ قتل کی سزا عمر قید ہے، لیکن حکام نے معصوموں کے قتل کے مقدمات میں کبھی کبھار ہی قانونی کارروائی کی۔

بے گھر بچے: سول سوسائٹی کے ذرائع کے مطابق عسکری کارروائیوں کے نتیجے میں متاثرہ بچوں کی آبائی علاقوں میں واپسی کے بعد حصول تعلیم اور نفسیاتی مدد تک رسائی مشکل تھی۔ سابقہ فاٹا کے ضلعوں میں، جہاں بڑی تعداد میں مقامی طور دربدر ہونے والے افراد کی واپسی ہوئی ہے، اٹھارہ سو سے زیادہ اسکول بند ہیں، جس کا سبب ان کو پہنچنے والا نقصان یا پھر مقامی لوگوں میں پایا جانے والا یہ خوف ہے کہ ان اسکولوں پر دہشتگرد حملہ کر سکتے ہیں۔ حکومت نے ان تنازعات سے متاثرہ علاقوں میں اسکولوں کی بحالی اور بچوں کے داخلے کا عمل تیز کرنے کو ترجیح دی لیکن ان کوششوں کے باوجود بین الاقوامی تنظیموں کے مطابق اسکول نہ جانے والے بچوں کی تعداد میں اضافہ دیکھا گیا۔

بچوں کے اغواء کے بین الاقوامی واقعات: پاکستان ۱۹۸۰ء کے ہیگ کنونشن آن دی سول ایسپیکٹس آف انٹرنیشنل چائلڈ ایبڈکشن کی توثیق کرنے والے ممالک میں شامل ہے۔ والدین کی جانب سے بچوں کے بین الاقوامی اغواء کے بارے میں محکمہ خارجہ کی درج ذیل لنک پر رپورٹ ملاحظہ کریں:

https://travel.state.gov/content/travel/en/International-Parental-Child-Abduction/for-providers/legal-reports-and-data.html

یہودی مخالفت

ملک میں یہودیوں کی آبادی بہت کم ہے۔ قومی پریس میں یہودی مخالف جذبات کا اظہار عام تھا۔ روایتی ذرائع ابلاغ اور سماجی رابطوں کے ذرائع پر نفرت

انگیز نشریات میں گروہوں یا افراد کو نشانہ بناتے ہوئے "یہودی ایجنٹ" جیسے توہین آمیز اصطلاحات استعمال کی گئیں۔ انتخابات کی مہم کے دوران کچھ مذہبی سیاسی جماعتوں کے رہنماؤں نے امیدوار عمران خان پر "صیہونی لابی کا ایجنٹ" ہونے کے الزامات لگائے، اس سلسلہ میں ان کی جمائمہ گولڈ اسمتھ سے سابقہ شادی کا حوالہ دیا گیا۔ اگست اور ستمبر میں نیدرلینڈ میں نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کارٹون بنانے کے متوقع مقابلوں کے خلاف احتجاجی مظاہروں کے دوران بعض مذہبی گروہوں نے پاکستان کے توہین رسالت کے قوانین کی توثیق کرتے ہوئے ان کا یورپ میں انکارِ ہولوکاسٹ کے قوانین سے موازنہ کیا۔ احتجاجی مظاہرین کے دوران جماعت اسلامی کی طلبہ تنظیم اسلامی جمیعت طلبہ نے سوشل میڈیا پر ہولوکاسٹ کارٹون مقابلے کروانے کی تجویز دی، جس کے نتیجہ میں اس کے سوشل میڈیا مداحوں نے نازی اور سواستیکا کے نشانات شیئر کیے۔

معذور افراد

قانون معذور افراد کو برابر حقوق فراہم کرتا ہے لیکن حکام نے ان قوانین پر عام طور پر عمل نہیں کیا۔ ۲۰۱۱ء میں وزارت سماجی بہبود اور خصوصی تعلیم تحلیل ہونے کے بعد اس سے منسلک محکمے بشمول ڈائریکٹوریٹ جنرل آف اسپیشل ایجوکیشن، معذوروں کی بحالی کے قومی کونسل اور قومی ٹرسٹ برائے معذور افراد کو وفاقی دارالحکومت انتظامیہ اور ترقی کے ڈویژن (کیڈ) کے حوالے کیا گیا۔ صوبوں کے حوالے کیئے جانے والے خصوصی تعلیم اور سماجی بہبود کے دفتر معذور افراد کے حقوق کے تحفظ کے ذمہ دار ہیں۔ ہر صوبے کے پاس معذور افراد کے امسال کے حصول تعلیم کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیئے قانونی طور پر ذمہ دار دفتر یا محکمہ ہے۔ ان قوانین کے باوجود، غیر سرکاری اداروں کے مطابق، خصوصی بچے اسکول نہیں جاسکے۔

وفاقی اور صوبائی سطح پر ملازمتوں کا مقرر کردہ کوٹہ نظام سرکاری اور نجی اداروں کو پابند کرتا ہے کہ کم از کم دو فیصد ملازمتیں معذوری کا شکار مگر قابل افراد کے لیئے مختص کریں۔ نفاذ کے نظام کے ناقص ڈھانچے کے باعث حکام اس قانونی تقاضہ کا مکمل طور پر اطلاق نہیں کر پائے۔ جو ادارے معذور افراد کو بھرتی نہیں کرنا چاہتے تھے وہ متبادل کے طور پر معذور افراد کے لیئے فنڈ میں جرمانہ ادا کر سکتے تھے۔ حکام نے کبھی کبھار اس ذمہ داری پر عمل درآمد کروایا۔ قومی کونسل برائے بحالیٔ معذور افراد نے ملازمتیں، قرض کی سہولت اور گزارے کے لیئے وظائف فراہم کیے۔ پولنگ اسٹیشن تک پہنچنے میں مشکلات کی وجہ سے معذور افراد کے لیئے انتخابات میں ووٹ ڈالنا بہر حال بہت مشکل عمل تھا۔ لیکن الیکشن ایکٹ ۲۰۱۷ء معذور افراد کی جانب سے بذریعہ ڈاک ووٹ ڈالنے کی اجازت دیتا ہے۔ بذریعہ ڈاک ووٹ دینے کی اہلیت کے لیئے معذور افراد کو مخصوص معذوری کے نشان والا شناختی کارڈ حاصل کرنا لازمی قرار دیا گیا ہے۔ معذور افراد کے حقوق کے لیئے کام کرنے والے کارکنوں کے مطابق پیچیدہ طریقہ کار کے باعث خصوصی کارڈ حاصل کرنا خاصہ اذیت ناک اور مشکل عمل ہے۔ اس کے علاوہ الیکشن کمیشن آف پاکستان نے ۲۰۱۸ء کے عام انتخابات میں ممکنہ حد تک پولنگ اسٹیشن پہلی منزل پر قائم کرنے اور ان تک معذور افراد کی رسائی ممکن بنانے کی خاطر ریمپ [ویل چیئر کے راستہ] سے قابل رسائی بنانے کی ہدایات جاری کیں لیکن مبصرین کے مطابق مذکورہ ہدایات کے باوجود ۷۲ فیصد پولنگ اسٹیشن معذور افراد کے لیئے قابل رسائی نہیں تھے۔

۲۵ مئی کو صوبائی سندھ اسمبلی نے معذور افراد کو بااختیار بنانے کا قانون پاس کیا۔ یہ صوبائی قانون متعدد نوعیت کی معذوریوں کو تسلیم کرتے ہوئے ان کے شکار افراد کو سرکاری اور نجی تعلیمی اداروں میں ہر سطح پر حصول تعلیم کے یکساں مواقع دینے کی ضمانت فراہم کرتا ہے۔ مذکورہ قانون یہ بھی صادر کرتا ہے کہ عوامی مقامات اور نئی عمارتوں کی تعمیر میں معذور افراد کی رسائی کے انتظامات کو یقینی بنایا جائے۔

جنسی اور صنفی بنیادوں پر روا پُر تشدد واقعات، امتیاز اور بد سلوکی

باہمی رضامندی سے ہم جنس پرستی مجرمانہ فعل ہے۔ ہم جنس پرست تعلقات کی مجوزہ سزا میں جرمانہ، دو سال سے عمر قید تک جیل یا پھر دونوں سزائیں شامل ہیں۔ ہم جنس پرست خواتین، ہم جنس پرست مرد، ہیجڑے، خواجہ سرا، مذکر و مؤنث دونوں خصوصیات کے حامل افراد [ایل جی بی ٹی آئی] نے کبھی کبھار ہی اپنی جنسی شناخت یا رجحان کو افشاء کیا۔ خواجہ سرا خواتین کی باقاعدہ سرگرم برادری موجود تھی مگر وہ بھی سماجی طور پر الگ تھلگ تھی اور تشدد اور بارہا چھیڑ خانی کا شکار پائی گئی۔

"ایل جی بی ٹی آئی" افراد کے خلاف تشدد اور امتیازی سلوک کا سلسلہ جاری رہا۔ اس طرح کے جرائم کا اکثر پتہ تک نہیں چلتا جبکہ پولیس بھی اطلاع ملنے کے بعد بہت کم کارروائی کرتی ہے۔ تاہم خیبر پختونخوا میں این جی اوز کی کوششوں کی بدولت پولیس اور خواجہ سرا برادری کے درمیان مسائل کے حل پر بات چیت میں اضافہ ہوا۔

ایل جی بی ٹی کے حقوق پر کام کرنے والی متعدد غیر سرکاری تنظیموں اور کارکنوں کے مطابق، معاشرے نے "ہیجڑا" کے طور پر معروف خواجہ سرا خواتین، مخنث اور انٹر سیکس افراد سے لاتعلقی اختیار کی ہوئی ہے۔ یہ افراد لفظ "ہیجڑا" کو تذلیل آمیز گمان کر کے اپنے لیئے "خواجہ سرا" کی اصطلاح استعمال کرنے کو پسند کرتے ہیں، یہ اکثر کچی آبادیوں میں رہائش پذیر ہوتے ہیں اور بھیک مانگ کر یا پھر میلوں اور شادیوں میں رقص کر کے اپنا پیٹ پالتے ہیں۔ ان میں سے کچھ جسم فروشی کا دھندہ بھی کرتے ہیں۔ مقامی حکام نے اکثر خواجہ سراؤں کا موروثی ملکیت پر حق تسلیم کرنے اور ان کو اسکول یا اسپتال میں داخلہ کی اجازت دینے سے انکار کیا جبکہ مکان مالکان بھی اس کمیونٹی کو گھر فروخت کرنے یا کرائے پر دینے سے کتراتے ہیں۔ ۹ مئی کو پارلیمان نے خواجہ سرا افراد کے تحفظ کا قانون مجریہ ۲۰۱۸ء پاس کر کے نئی تاریخ رقم کی۔ یہ قانون ان کی بے شمار مشکلات کو حل کرنے پر توجہ دیتا ہے۔ مذکورہ قانون خواجہ سرا افراد کو اپنی "تصور کردہ جنس" کے طور پر شناخت اختیار کرنے، بنیادی حقوق کی ضمانت، ہراسگی سے تحفظ فراہم کرتا ہے اور ملازمت، رہائش، تعلیم، صحت کی دیکھ بھال اور دیگر سہولیات میں ان کے خلاف امتیازی سلوک کو غیر قانونی قرار دیتا ہے۔

سپریم کورٹ کی جانب سے ۲۰۱۲ء میں ایک فیصلے میں خواجہ سرا افراد کو "تیسری جنس" کے طور پر تسلیم کر کے ان کو قومی شناختی کارڈ حاصل کرنے کی اجازت دی گئی۔ چونکہ قومی شناختی کارڈ ووٹ کے اندراج کے لیئے بھی استعمال ہوتا ہے لہٰذا اس فیصلہ کی بدولت خواجہ سرا افراد ۲۰۱۳ء کے انتخابات میں بحیثیت امیدوار اور ووٹر شریک ہوئے۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان اور نادرا نے بین الاقوامی اداروں کی مدد سے جولائی میں منعقد ہونے والے عام انتخابات سے قبل شناختی کارڈ بنوانے اور اندراج ووٹ کی مہم شروع کی۔ ۱۳ خواجہ سرا افراد نے انتخابات میں بحیثیت امیدوار حصہ لیا، تاہم ان میں سے کوئی بھی جیت نہیں سکا۔ الیکشن مبصرین اور خواجہ سرا برادری نے انتخابات کے روز خواجہ سرا ووٹروں کی ہراسگی کے واقعات کی اطلاع دی جبکہ سندھ کے محکمہ داخلہ نے مبینہ طور پر ۲۵ خواجہ سراؤں کو الیکشن کمیشن کی جانب سے جاری کیئے گئے خصوصی "ایکریڈیشن کارڈ" سیکیورٹی وجوہات کا بہانہ بنا کر ضبط کر لیئے۔ فری اینڈ فیئر الیکشن نیٹ ورک کی رپورٹ کے، جس میں ۱۲۵ خواجہ سرا مبصرین کی رائے بھی شامل تھی، مطابق اسلام آباد، لاہور اور کراچی میں قانون نافذ کرنے والے حکام نے خواجہ سرا ووٹروں کے ساتھ تعاون اور ترجیحی سلوک کا مظاہرہ کیا۔ اس کے برعکس پشاور اور کوئٹہ میں خواجہ سرا ووٹروں کو ہراسگی کا سامنا کرنا پڑا۔

ایچ آئی وی اور ایڈز کے متعلق معاشرتی حقارت

ملک میں ایچ آئی وی ایڈز کی بیماری صفر اعشاریہ ایک فیصد آبادی میں پائی جاتی ہے۔ یہ بیماری مخصوص آبادیوں خاص طور پر ٹیکے کے ذریعہ سے نشہ کرنے والے افراد میں عام ہے۔ عام لوگوں اور حفظان صحت کے ذمہ دار عملے کی جانب سے حقارت اور امتیازی سلوک اس مرض میں مبتلا افراد کی علاج تک رسائی میں بڑی رکاوٹ بنا رہا۔

دیگر نوعیت کا سماجی تشدد اور امتیازی سلوک

مذہبی عدم برداشت کے باعث سماجی تشدد ایک گھمبیر مسئلہ بنا رہا۔ عیسائی،، ہندو، احمدی اور شیعہ مسلمانوں سمیت مذہبی اقلیتوں کے خلاف گاہے بگاہے بلوہ کی اطلاعات موصول ہوتی رہیں۔ بلوچستان کے شہر کوئٹہ میں ہزارہ نسل سے تعلق رکھنے والی شیعہ اقلیت کو امتیازی سلوک اور تشدد کے خطرے کا سامنا رہا۔ اخباری اطلاعات اور دیگر ذرائع کے مطابق، ہزارہ برادری کے افراد اپنے مخصوص رہائشی علاقوں سے باہر نکل کر کوئٹہ شہر میں آزاد نقل و حرکت کرنے سے قاصر تھے۔ برادری کے ارکان نے شکایت کی کہ حفاظتی انتظامات نے ان کے محلوں کو الگ تھلگ بستیوں میں تبدیل کر دیا تھا، جس کے نتیجہ میں ان لوگوں کا معاشی استحصال ہو رہا تھا۔ ان رہائشی علاقوں میں عام استعمال کی اشیاء مہنگے داموں پر دستیاب تھیں، جبکہ ہزارہ افراد کے مطابق ان کو تلاش روزگار اور اعلیٰ تعلیم کے حصول میں رکاوٹوں کا سامنا بھی تھا۔ انہوں نے یہ بھی الزام لگایا کہ سرکاری ادارے شناختی کارڈ اور پاسپورٹ جاری کرنے میں امتیازی تفریق کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ پُر تشدد واقعات سے بچاؤ کے پیش نظر حکام نے شیعہ جلوس بھی ہزارہ برادری کے مذکورہ رہائشی مضافات تک محدود کر دیئے۔

حصہ ہفتم۔ محنت کشوں کے حقوق

الف) انجمن سازی کی آزادی اور اجتماعی سوداکاری کا حق

افرادی قوت کی اکثریت صوبائی لیبر قوانین کے تابع تھی۔ ۲۰۱۰ء کی اٹھارویں آئینی ترمیم نے محنت کشوں کے بارے میں قانون سازی اور پالیسی کے اختیارات چاروں صوبوں کو منتقل کیئے لیکن ساتھ یہ بھی صادر کیا کہ موجودہ قوانین اس وقت تک نافذ العمل رہیں گے جب تک صوبائی حکومت ان کو "تبدیل، ختم یا ترمیم نہیں کرتی"۔ صوبوں نے ۲۰۱۱ء میں اپنے مقامی صنعتی تعلقات کے قوانین بھی نافذ کیے۔

۲۰۱۲ء میں پارلیمینٹ نے صنعتی تعلقات کا نیا ایکٹ پاس کیا، جس میں بین الاقوامی ادارہ برائے محنت کش افراد (آئی ایل او) کے قوانین کو بھی شامل کیا گیا مگر ان کو فقط وفاقی دارالحکومت اسلام آباد اور ان تجارتی انجمنوں پر نافذ العمل قرار دیا گیا جو کہ ایک سے زیادہ صوبوں میں فعال تھیں۔

اختیارات کی نچلی سطح تک منتقلی کے بعد وفاقی حکومت کا کردار غیر واضح رہا۔ محنت کش افراد کے امور کے بارے میں کچھ حد تک با اختیار وفاقی ادارہ وزارتِ برائے سمندر پار پاکستانی وترقی انسانی وسائل تھا، جس کا مقامی لیبر کی نگرانی میں کردار آئی ایل او ضوابط پر عملدرآمد دکھانے کی غرض سے اعداد وشمار جمع کرنے تک محدود تھا۔ صوبائی سطح پر اجتماعی سودے کاری کے حقوق یقینی بنانے والے قوانین کی عملداری میں بینکاری اور مالیاتی شعبہ، جنگلات، طبی عملہ، اپنا کاروبار کرنے والے کسان اور انتظامی عہدوں پر تعینات افراد شامل نہیں تھے۔

قومی سطح کی قانون سازی اور مزدوروں کے امور کے ذمہ دار وفاقی ادارے کی غیر موجودگی میں، قومی کمیشن برائے صنعتی تعلقات کا تاحال وجود میں رہنا ایک سوالیہ نشان ہے۔ وفاقی صنعتی تعلقات ایکٹ ۲۰۱۲ء بیان کرتا ہے کہ یہ کمیشن وفاقی دارالحکومت اسلام آباد کی حدود میں ان صنعتی تنازعات کا فیصلہ کرے گا جن میں ٹریڈ یونین یا ٹریڈ یونین کی فیڈریشن فریق ہے اور یہ کمیشن حکومت کی جانب سے تعین کیئے گئے قومی اہمیت کے دیگر کسی تنازعہ کو حل کرنے کا بھی ذمہ دار ہوگا۔ لیکن یہ قانونی شق بین الصوبائی تنازعات کے حوالہ سے خصوصی فورم فراہم نہیں کرتی ہے مگر بظاہر اس امکان کو اظہار کرتی ہے کہ کمیشن اس نوعیت کے تنازعات حل کر سکتی ہے۔ محنت کشوں کے حقوق کی تنظیموں نے لیبر ریلیشنز قوانین کو صوبائی سطح پر نافذ کرنے میں اہلیت اور مالی وسائل کی عدم دستیابی کے مسائل کی نشاندہی کی۔

قانون ریاستی عہدیداروں، سرکاری تجارتی اداروں اور ایکسپورٹ پراسیسنگ زونز یا سرکاری شعبے کے کارکنوں کو اجتماعی سودے کاری یا ہڑتال کرنے سے منع کرتا ہے۔ صوبائی انڈسٹریل ریلیشنز قوانین بھی ہڑتال اور تالابندی کو محدود کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر خیبر پختونخوا کا ایکٹ بیان کرتا ہے کہ "اگر ہڑتال یا تالابندی تیس دن سے زیادہ عرصہ تک برقرار رہتی ہے تو، حکومت تحریری حکم نامے کے تحت ہڑتال یا تالابندی پر پابندی نافذ کر سکتی ہے" اور بعد ازاں لازمی طور پر تنازعہ کو لیبر کورٹ میں لے جائے گی۔

وفاقی قانون غیر قانونی ہڑتالوں، دھرنہ بازی اور دیگر اقسام کے احتجاج کو سول بدامنی کا باعث جرم ٹھہراتا ہے، جس کی سزا عمر قید تک ہے۔ یہ قانون بیان کرتا ہے کہ چار یا اس سے زائد افراد کے اجتماع کے لیئے پولیس کی اجازت لازمی ہے، اس شق کو حکام ٹریڈ یونین کے اجتماعات کے خلاف استعمال کرنے کے مجاز ہیں۔ تاہم اس کے باوجود یونین تنظیمیں بڑے پیمانے پر احتجاجی دھرنے منعقد کرنے میں کامیاب ہو جاتی تھیں لیکن پولیس نے ان ہڑتالوں کو ناکام بنایا اور آجروں نے ان اقدامات کو ملازمین کی برطرفی کے لیئے بطور عذر استعمال کیا۔ جنوری میں تنخواہوں کے لیئے احتجاج کرنے والے اساتذہ پر پولیس نے طاقت کا استعمال کیا اور ساٹھ مظاہرین کو گرفتار کیا۔ وزیر اعلیٰ مراد علی شاہ نے پولیس کے اقدامات کو ناقابل قبول قرار دیا۔ پولیس کی جانب سے بعض اوقات گرفتاریوں کے باوجود احتجاجی مارچ اور دھرنے منعقد ہوتے رہے۔

سیاسی منشا اور وسائل کی قلت کے باعث لیبر قوانین کا نفاذ بڑے پیمانے پر کمزور رہا۔ زیادہ تر تنظیمیں حکومت یا کسی بھی سیاسی پارٹیوں کے اثر سے آزاد ہو کر کام کرتی رہیں۔ مزدور رہنماؤں نے مؤثر یونین سازی کی راہ میں رکاوٹ ڈالنے کی غرض سے مالکان کی مالی اعانت سے قائم کردہ "انتظامیہ۔ دوست" اور کاغذی ورکر یونین "یا نام نہاد "ییلو یونینز" کی موجودگی پر تحفظات کا اظہار کیا۔

حکومت کی جانب سے جائز طریقہ ہائے کار کے بغیر کسی یونین کو تحلیل کرنے کی کوئی رپورٹ نہیں موصول ہوئی۔ تاہم اس کے باوجود انتظامی طور پر یونین کی رجسٹریشن عدالتی جائزے کے حق کے بغیر رد کی جاسکتی تھی۔

مزدوروں کے حقوق کے لیئے سرگرم غیر سرکاری تنظیموں نے محنت کشوں کی مدد کرتے ہوئے ان کو فنی تربیت اور صلاحیتوں کو بہتر بنانے کی تربیتی نشستیں منعقد کیں جس کا مقصد لیبر یونینز اور ٹریڈ تنظیموں کو مضبوط کرنا تھا۔ انہوں نے پہلے سے قائم لیبر یونینز کے ساتھ مل کر غیر رسمی شعبے میں کام کرنے والے مزدوروں کو متحد کرنے اور مزدوروں کے حقوق کام کرنے کے حالات اور خوشحالی کو یقینی بنانے کے لیئے پالیسیوں اور قانون سازی کے لیئے سرگرمی کی۔ این جی اوز نے صوبائی حکومتوں کے ساتھ مل کر زرعی کارکنوں، بھٹہ مزدوروں اور خطرات سے دوچار دیگر محنت کشوں کو قومی شناختی کارڈ کی فراہمی پر کام کیا تاکہ ان کو بھی ملک کے سماجی تحفظ کے نظام میں لایا جاسکے اور ووٹ، صحت اور تعلیم کی سہولیات سمیت شہری حقوق تک رسائی دی جاسکے۔

ب) جبری مشقت یا بیگار کی ممانعت

قانون ہر قسم کی جبری مشقت اور بیگار سے ممانعت، اور بیگار کیمپ کا قرضہ منسوخ کرتا ہے اور اس کی وصولی کے لیئے قانونی چارہ جوئی پر بھی پابندی عائد کرتا ہے، جبکہ اس قانون کے نفاذ کے لیئے ضلعی "نگراں کمیٹی" قائم کرنے کا حکم دیتا ہے۔ دوسری جانب وفاقی اور صوبائی قوانین ملازمین کو آجر سے اجازت لیئے بغیر ملازمت چھوڑنے سے منع کرتے ہیں، کیوں کہ ملازمت چھوڑنے کی وجہ پر آجر کی جوابی قانونی کارروائی کی صورت میں ان مزدوروں کو قید بامشقت کی سزا ملنے کے امکانات موجود رہتے ہیں۔

مئی میں پارلیمینٹ نے بردہ فروشی کے خلاف جامع قانون پاس کیا۔ قانون طاقت، دھوکہ دہی یا مکاری کے ذریعہ کسی بھی شخص کو جبری مشقت یا جنسی کاروبار میں استعمال کی خاطر بھرتی، تیار، منتقل یا کسی دوسرے شخص کو اس مقصد سے حاصل کرنے کے عمل کو ٹریفکنگ ان پرسنس (انسانی اسمگلنگ یا بردہ فروشی) قرار دیتا ہے۔ اس نوعیت کی غیر قانونی منتقلی کی سزا دس سال قید یا دس لاکھ روپے (۷،۲۰۰ ڈالر) جرمانہ ہے۔ اگر کسی بچے یا عورت کے خلاف ہو تو سزا کم از کم دو سال اور جرمانہ دس لاکھ روپے (۷،۲۰۰ ڈالر) ہونا چاہیئے۔ اگر حالات سنگین ہوں تو سزا ۱۴ سال یا کم از کم تین سال سے کم نہیں اور جرمانہ بیس لاکھ روپے (۱۴،۴۰۰ ڈالر) ہونا چاہیئے۔

سیاسی عزم کی کمی، حکام کی مبینہ طور پر انسانی اسمگلنگ میں ملوث ہونے، قانون میں تکنیکی خامیوں، وفاقی اور مقامی حکومتوں میں انتظامی تبدیلیوں اور مالی وسائل کی عدم دستیابی کی وجوہات جبری مشقت سے متعلقہ وفاقی قوانین نافذ کرنے میں حکام کی ناکامی کا باعث بنیں رہیں۔ وسائل، معائنہ اور ازالہ کی انتظامات بالکل ناکافی تھے۔

ملک کی متعدد صنعتوں میں جبری مشقت اور بیگار کا عمل وسیع طور پر پایا جاتا ہے۔ این جی اوز کے اندازے کے مطابق بیس لاکھ کے قریب افراد بیگار کا شکار تھے، جن میں سے زیادہ تر سندھ اور پنجاب میں تھے، لیکن بلوچستان اور کے پی میں بھی ایسے افراد موجود تھے۔ بیگار میں کام کرنے والوں میں زیادہ تر نچلی ذات کے ہندو اور عیسائی، جبکہ پسماندہ سماجی و معاشی پس منظر کے مسلمان شامل تھے۔ جبری مشقت شعبہ زراعت، بشمول کپاس، گنے اور گندم کی صنعتوں اور اس کے علاوہ اینٹوں، کوئلے اور قالین سازی کی صنعتوں میں بھی پائی جاتی تھی۔ بیگار میں کام کرنے والے محنت کش عام طور پر یہ تخمینہ لگانے سے قاصر تھے کہ ان کی جانب واجب الادا قرض مکمل طور پر ادا ہو چکے ہیں یا نہیں، جس کی بڑی وجہ معاہدے کی عدم موجودگی، یا پھر مالکان

کی جانب سے مزدوروں کی ناخواندگی کا فائدہ اٹھا کر قرضوں کی رقم یا بیج اور کھاد کی قیمتوں میں ردوبدل کرنا تھا۔ بعض دفعہ تو ایسا ہوا کہ زمینداروں نے مسلح محافظ مقرر کر کے مزدوروں کی نقل و حرکت پر بندش لگادی یا ان کی طرف واجب الادا قرض کے عوض دوسرے آجروں کو فرخت کر دیا۔

زمینداروں، صنعتکاروں اور بااثر سیاستدانوں کے آپس میں تعلقات کی وجہ سے مسائل کو جڑ سے اکھاڑنے کی کوششوں کو دھچکا پہنچا۔

مثال کے طور پر کچھ مقامی پولیس والوں نے زمین یا بھٹہ مالکان کے خلاف یہ سوچ کر مؤثر کارروائی کرنے سے گریز کیا کہ ان کے افسران بالا شاید سیاست دانوں یا مالکان کے اپنے دباؤ سے متاثر ہو کر قانونی تفتیش کی حمایت سے دستبردار ہو جائیں گے۔ جبری بیگار سے آزاد ہونے والے بعض مزدوروں کو دوسرے مقامات پر متبادل روزگار کے مواقع میسر نہ ہونے کی وجہ سے اپنی پرانی حیثیت پر واپس جانا پڑا۔

لڑکوں اور لڑکیوں کو غیر قانونی بھکاری گروہوں، گھریلو ملازمت یا زراعت کے شعبہ میں جبری مشقت کے لیئے استعمال کرنے کی غرض سے خرید و فروخت، اغوا یا کرائے پر حاصل کرنے کا سلسلہ جاری رہا۔ (ملاحظہ کیجیئے سیکشن ہفتم کاج)۔ غیر قانونی ایجنٹوں نے بہتر ملازمت کے جھانسے دے کر بچوں کے والدین سے پیسے بٹورنے کے بعد بچوں کا استحصال کرتے ہوئے ان سے گھریلو ملازمت، غیر ہنر مند لیبر اور چھوٹی دکانوں اور دیگر شعبوں میں جبری مشقت کروائی۔

محکمہ لیبر پنجاب نے اینٹوں کے بھٹوں میں بچوں سے مزدوری کرانے کے سدباب اور جبری مشقت کے خاتمہ کے منصوبہ کے تحت ورکرز کو قومی شناختی کارڈ، سود سے پاک قرض اور بھٹوں کے آس پاس اسکول کی فراہمی میں مزدوروں کی اعانت کرنے کا سلسلہ جاری رکھا۔ ۲۰۱۴ء میں آغاز سے لے کر اب تک، اس منصوبے کے ذریعہ سے نوے ہزار بچوں کو اینٹوں کے بھٹوں سے ہٹا کر اسکولوں میں داخل کرایا جا چکا ہے۔ خیبر پختونخوا، پنجاب اور سندھ کی لیبر وزارتوں نے اینٹوں کے بھٹوں اور ان میں کام کرنے والے کارکنوں کے اندراج پر کام کیا تا کہ اس صنعت کو مؤثر انداز میں چلایا جا سکے اور مزوروں کی لیبر کورٹ اور دیگر سہولیات تک رسائی ممکن بنائی جا سکے۔ انٹرنیشنل لیبر آرگنائیزیشن (آئی ایل او) حکام کے مطابق خیبر پختونخوا اور پنجاب حکومتوں نے اپنے صوبوں میں موجود لگ بھگ تمام تر بھٹوں کا اندراج مکمل کر لیا ہے، جبکہ پنجاب نے بھٹوں کی ڈیجیٹل میپنگ بھی مکمل کر لی ہے۔

اس ضمن میں محکمہ خارجہ کی ٹریفکنگ اِن پرسنس رپورٹ بھی مندرجہ ذیل ویب لنک پر ملاحظہ کیجیے:

www.state.gov/j/tip/rls/tiprpt/

اور بچوں سے مشقت کے بدترین طریقوں کے بارے میں محکمہ خارجہ کی رپورٹ بھی نیچے دی گئی لنک پر دستیاب ہے:

www.dol.gov/ilab/reports/child-labor/findings

ج) بچوں سے مشقت کی ممانعت اور ملازمت کے لیئے کم از کم عمر

ملکی قانون ۱۴ برس سے کم عمر بچوں کی کارخانے، کان اور دیگر خطرناک مقامات پر ملازمت پر سختی سے پابندی عائد کرتا ہے۔ تاہم بچوں کی ملازمت کے بارے میں قومی قانون خطرناک مقامات پر کام کے لیئے کم سے کم عمر پندرہ سال مقرر کرتا ہے، جو بھی بین الاقوامی قوانین کے مطابق نہیں ہے۔ خیبر پختون خوا، سندھ اور پنجاب میں صوبائی قوانین بین الاقوامی معیار کے موافق خطرناک مقامات پر کام کی کم از کم عمر اٹھارہ یا انیس سال مقرر کرتے ہیں۔ ان پابندیوں کے باوجود ملک بھر سے بچوں کے بارے میں اطلاعات تھیں کہ وہ قانون میں خطرناک قرار دیئے گئے مقامات جیسا کہ چمڑے کی صنعت، خشت سازی اور گہرے سمندر میں ماہی گیری کے شعبوں میں کام کر رہے ہیں۔

قومی قانون خطرناک مقامات پر ملازمت کے لیئے کم سے کم عمر پندرہ سال مقرر کرتا ہے لیکن اس پابندی کا غیر رسمی شعبوں پر اطلاق نہیں ہوتا۔ قانونی طور پر ملازمت کرنے والے بچوں کے لیئے قانون کام کے اوقات کار سات گھنٹے مقرر کرتا ہے، جس میں ہر تین گھنٹے کی محنت کے بعد ایک گھنٹہ آرام بھی شامل ہے جبکہ یہ قانون کام کے لیئے وقت تعین اور چھٹی کی سہولت بھی فراہم کرتا ہے۔ قانون بچوں کے اوور ٹائم یا رات کے وقت کام کرنے سے ممانعت کرتا ہے اور یہ بھی صادر کرتا ہے کہ ان کو ہفتے میں ایک چھٹی ملنی چاہیئے۔ اس کے ساتھ قانون آجروں کو پابند کرتا ہے کہ وہ لیبر انسپکٹر کی جانب سے تصدیق کو یقینی بنانے کے لیئے کمسن مزدوروں کے اندراج کا رجسٹر ساتھ رکھیں۔ یہ پابندیاں اور قواعد وضوابط گھریلو کاروبار پر لاگو نہیں ہوتیں۔ تاہم سندھ اسمبلی نے ۹ مئی کو صوبے میں گھریلو ملازمین کے حقوق کے تحفظ کا قانون پاس کیا، جو کہ ان کو ویلفیئر حقوق، تحفظ، کم از کم تنخواہ، مالک کی اعانت سے ویلفیئر فنڈ کے قیام اور گھر مالکان نگرانی کی کونسل اور ملازمت کی رجسٹریشن، اور تنازعات کے حل کے بارے میں طریقہ ہائے کار وضع کرتا ہے۔

وفاقی قانون اٹھارہ سال سے کم عمر بچوں کے استحصال کی ممانعت کرتا ہے، اور جسمانی کھیل، جنسی حرکات اور دیگر بدسلوکی والی سرگرمیوں کو استحصالی تفریح قرار دیتا ہے۔ بچوں کا استحصال کرنے والے والدین قانون کو جوابدہ ہیں۔

بچوں سے مشقت لینے کا سلسلہ جوں کا توں جاری رہا اور متعدد بچے زراعت اور گھریلو ملازمت سے وابستہ رہے۔ ایسی بھی اطلاعات تھیں کہ چھوٹی ورکشاپوں میں زیادہ کمسن مزدور ملازمت کر رہے ہیں، جس کے باعث انسداد چائلڈ لیبر قوانین نافذ کرنے میں دشواریاں پیش آئیں، کیونکہ قانون معائنہ کاروں کو کسی بھی ایسے مقام پر چھاپہ مارنے کی اجازت نہیں دیتا جہاں پر دس سے کم افراد ملازمت کر رہے ہوں۔ غریب دیہاتی خاندانوں نے بعض اوقات اپنے بچوں کو گھریلو ملازمت یا دیگر اقسام کے کام کے لیئے فروخت کیا یا ایجنٹوں کو ایسے کسی کام کا انتظام کرنے کے لیئے معاوضہ دیا۔ ان کا خیال تھا کہ ان کے بچے اچھے ماحول میں کام کریں گے۔ تعلیم فراہم کرنے یا دیگر مراعات کے بدلے رشتہ داروں یا جاننے والوں کے ہاں کام کرنے کے لیئے بھیجے گئے بچے بھی استحصالی حالات اور جبری مشقت کا شکار ہوئے۔ منظم بھکاری ٹولوں، گھریلو ملازمت، عسکری اور جرائم پیشہ ٹولوں، اور جنسی فحاشی کی غرض سے اسمگلنگ کے جرائم میں استعمال ہونے کے لیئے بچوں کے اغوا یا خرید و فروخت کے واقعات رونما ہوئے۔

بچوں سے مشقت کے مسائل کے خلاف وفاقی سطح کی کارروائیاں بے اثر رہیں۔ اختیارات کی نچلی سطح پر منتقلی کے نتیجہ میں مزدوروں کا معائنہ وفاق کی بجائے صوبائی سطح پر کیا گیا، جس کے باعث لیبر قانون کے غیر متوازن استعمال میں اضافہ ہوا۔ قانون نافذ کرنے کی طاقت مسئلہ کے حجم کے مقابلے میں کم رہی۔ انسپکٹروں کے پاس تربیت اور وسائل کی کمی تھی اور ان پر بدعنوانی میں ملوث ہونے کا شک کیا جا سکتا تھا۔ بچوں سے مشقت کے قانون کی

خلاف ورزی پر حکام نے سینکڑوں شکایتیں درج کیں لیکن قانون کی پامالی کے مرتکب افراد پر لاگو کیا جانے والا جرمانہ مستقبل میں ان کو اس جرم سے باز رکھنے کے اعتبار سے بالکل کم تھا۔ حکام نے این جی اوز کو آزادانہ طور پر معائنہ کرنے کی اجازت دی ہوئی تھی۔

د) ملازمت اور پیشہ کے حوالہ سے امتیازی سلوک

اگرچہ قوائد وضوابط ملازمت اور پیشہ ورانہ ماحول میں میں نسل، جنس، معذوری، زبان، صنفی شناخت، ایچ آئی وی یا دیگر وبائی بیماری یا سماجی حیثیت کی بنیاد پر امتیازی سلوک کرنے سے روکتے ہیں تاہم حکومت نے ان قوانین کو مؤثر انداز میں نافذ نہیں کیا۔ مذکورہ حقائق کی بنیاد پر ملازمت اور پیشہ ورانہ ماحول میں تفریق چھائی رہی۔

ہ) کام کرنے کے لیئے قابل قبول حالات

۲۰۱۰ء میں اٹھارویں آئینی ترمیم کی منظوری کے بعد وفاقی وزارت برائے محنت اور افرادی قوت تحلیل کر کے محنت کشوں کے امور صوبوں کے حوالے کیئے گئے۔ مزدوروں کی نمائندہ تنظیموں، بین الاقوامی اداروں اور این جی اوز نے انتقال اختیار پر تنقید کرتے ہوئے کہا کہ کم از کم اجرت، مزدوروں کے حقوق، قومی لیبر معیار اور بین الاقوامی لیبر قوانین پر عملدرآمد کی نگرانی سمیت محنت کشوں کے امور وفاقی حکومت کے دائرہ اختیار میں رہنے چاہئیں۔ مبصرین نے صوبوں کی صلاحیتوں اور عزم پر بھی تحفظات کا اظہار کیا کہ وہ کیسے لیبر قوانین کو اپنا کر عملدرآمد کر سکتے ہیں۔ اس کے برعکس، کچھ بین الاقوامی تنظیموں نے یہ بھی کہا کہ اختیارات کی منتقلی سے کچھ صوبوں میں صوبائی اداروں کی کارکردگی، خاص طور پر معائنہ کی صلاحیت، میں بہتری پائی گئی۔

جولائی ۲۰۱۷ء میں حکومت نے غیر ہنر مند مزدوروں کی تنخواہ ۱۴،۰۰۰ روپے (۱۰۰ ڈالر) سے بڑھا کر ۱۵،۰۰۰ روپے (۱۰۸ ڈالر) ماہانہ کر دی جبکہ تمام صوبائی بجٹ میں بھی اس ہدایت پر عمل کرنا لازمی تھا۔ یہ کم سے کم تنخواہ عالمی بینک کی جانب سے لگائے گئے غربت کے خاتمہ کے لیئے درکار تنخواہ سے زیادہ تھی۔ حکام نے سالانہ بجٹ میں کم از کم اجرت میں اضافہ کیا جبکہ وفاقی اور صوبائی دونوں حکومتوں نے اس اضافہ پر فوری عمل درآمد کے نوٹیفکیشن جاری کیئے۔ بہر حال، کم از کم اجرت کے قانون کا نفاذ محنت کشوں کے اہم شعبوں، بشمول غیر روایتی شعبے، گھریلو ملازمین اور شعبہ زراعت سے وابستہ مزدوروں پر نہیں ہوتا جبکہ کم از کم تنخواہ کے قوانین کا نفاذ بھی غیر متوازن تھا۔ حکومت نے ۲۰۱۸ء-۱۹ کے بجٹ میں کم از کم اجرت کے معاملہ پر توجہ نہیں دے کر ماضی میں ہر سال تنخواہ بڑھانے کی روایت سے ناغہ کیا۔

قانون زیادہ سے زیادہ ۴۸ گھنٹہ فی ہفتہ (موسمی کارخانوں کے لیئے ۵۴ گھنٹے) کام کرنے کی حد کا تعین کرتا ہے۔ جس میں کام کے دوران آرام کا وقفہ اور تنخواہ کے ساتھ سالانہ چھٹیاں شامل ہیں۔ لیبر کوڈ کے تحت اضافی مراعات میں سرکاری چھٹیاں، اوور ٹائم، سالانہ اور بیماری کی صورت میں چھٹی،

صحت کی دیکھ بھال، مزدوروں کے بچوں کے لیئے تعلیم، اولڈ ایج مراعات اور ورکرز ویلفیئر فنڈ کی مراعات شامل ہیں۔ لیکن بہت سے مزدور کانٹریکٹ لیبر کے طور پر بھرتی کیئے گئے تھے، جن کو بنیادی اجرت کے سوا کوئی بھی مراعات یا ملازمت کا تحفظ حاصل نہیں تھا اگرچہ وہ کئی سالوں سے ایک ہی آجر کے پاس کام کرتے چلے آرہے ہوں۔ یہ قوانین شعبہ زراعت کے محنت کشوں، دس سے کم ملازمین والے کارخانوں، گھریلو ملازمین پر لاگو نہیں ہوتے۔ ان اقسام کی ملازمتوں

وابستہ ملازموں کو ازالے کے لیئے لیبر عدالتوں سے رجوع کرنے کا حق بھی حاصل نہیں جس کے باعث ان کے استحصال کا شکار ہونے کے شدید خطرات منڈلاتے رہے۔ بیشمار قوانین کی غیر فعالیت اور حکومت کی جانب سے نفاذ میں کوتاہی نے بہت سے شعبوں میں آجروں کو کام کے ماحول، ملازمین سے برتاؤ، کام کے اوقات اور تنخواہ کے معاملات میں جوابدہی سے نسبتاً بریت دے رکھی تھی۔

محنت کشوں سے متعلق قومی قوانین کو نافذ کرنا صوبائی حکومتوں کی بنیادی ذمہ داری ہے۔ محدود وسائل، بدعنوانی اور ناکافی انتظامی ڈھانچے کی عدم موجودگی کے باعث نفاذ غیر مؤثر تھا۔ صوبائی حکومت کی جانب سے بھرتی کردہ معائنہ کاروں کی تعداد لگ بھگ چھ کروڑ چالیس لاکھ محنت کش افرادی قوت کے لیئے بالکل ناکافی ہے۔ متعدد کارکن، خاص طور پر غیر رسمی شعبہ میں کام کرنے والے، اپنے حقوق سے بے خبر تھے۔ لیبر معائنہ کے لیئے محدود وسائل اور بدعنوانی کے باعث لیبر انسپیکشن اور سزائیں لیبر قوانین کی خلاف ورزی کی روک تھام کے حساب سے ناکافی تھیں۔

سندھ کی صوبائی حکومت نے ۲۰۱۷ء میں پیشہ ورانہ صحت اور تحفظ کا قانون نافذ کیا۔ اس نوعیت کا قانون دیگر صوبوں میں موجود نہیں ہے۔ قومی سطح پر مختلف شعبوں میں صحت اور حفاظت کے انتظامات غیر معیاری تھے۔ صحت وصفائی کے بین الاقوامی معیار پر پورا اترنے میں ناکامی نے ملک کی بیرون ملک درآمد کے لیئے قابل بھروسہ ملک ہونے کے حوالے سے شکوک وشبہات کو جنم دیا۔ کان کنی کی صنعت میں حفاظت اور صحت کے اصولوں کی پاسداری میں سخت کوتاہی تھی۔ بہت ساری کانوں میں داخلہ، اخراج اور ہوا خوری کا ایک ہی سوراخ تھا۔ کام کرنے کے خطرناک ماحول سے جان چھڑانے کے لیئے مزدوروں کے پاس روزگار گنوانے کا خطرہ مول لینے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ غیر روایتی شعبہ کے کارکنوں، خاص طور پر پوشیدہ جگہوں جیسے گھریلو ملازمت میں، صحت اور حفاظت کے حوالہ سے نازک صورتحال کا سامنا تھا۔ مذکورہ سال کے دوران مقام ملازمت پر اموات اور حادثات کے حوالہ سے سرکاری طور پر جمع کردہ اعداد وشمار موجود نہیں تھے۔ مل منتظمین اکثر آتشزدگی یا دیگر حادثہ کے متاثرہ فرد کی شناخت کی تصدیق سے قاصر تھے کیوں کہ ان افراد کا کنٹریکٹ ملازمین ہونے کی وجہ سے کوئی بھی ریکارڈ دستیاب نہیں تھا۔

ستمبر میں خیبر پختونخوا کے علاقہ کوہاٹ میں کوئلے کی کان کی چھت گرنے کے باعث ۹ کان مزدور جاں بحق اور تین زخمی ہوگئے۔ ۱۲ اگست کو بلوچستان میں کوئلے کی کان میں دھماکے سے تیرہ مزدور ہلاک ہوئے جبکہ دو جان بچانے والے اہلکار بھی میتھین گیس کے اخراج سے موت کا شکار ہوئے۔ مئی سے جون کے درمیان ایک مہینے کے عرصہ میں بلوچستان میں کوئلے کی کانوں میں تین بڑے حادثات میں ۲۷ لوگ لقمہ اجل بنے۔ مزدور تنظیموں کے اندازے کے مطابق ہر سال بلوچستان میں لگ بھگ ۸۰ کان مزدور جاں بحق ہوتے ہیں۔ سندھ میں ایک گودام میں بوائلر کے دھماکہ سے چھت گرنے کی وجہ سے تیرہ مزدور فوت ہوئے۔ اس واقعہ میں دو کمسن مزدوروں نے بھی جان گنوائی۔

####